ہفت روزہ
الفتح
کراچی

پاکستانی جنگی قیدی

اشاعتِ خاص

قیمت : ایک روپیہ
ہوائی ڈاک سے : ایک روپیہ ۲۵ پیسے

۲۳-۳۰ اگست ۱۹۷۳ء



وزیرِ اعلیٰ سندھ
ممتاز بھٹو کا پیغام

جنگی قیدیوں کی فوری رہائی

انسانیّت کا تقاضا ہے



بھارت نے بین الاقوامی قانون اور شملہ سمجھوتہ کی اسپرٹ کے خلاف اب تک ترانوے ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں کو روک رکھا ہے۔

علاوہ ازیں یہ ایک انسانی مسئلہ بھی ہے۔ صرف فوجیوں ہی کو نہیں بلکہ شہریوں کی ایک بڑی تعداد کو بھی نظر بند رکھا گیا ہے۔ اس مسئلے سے متعلقہ ممالک اور عالمی برادری کو نظر بند فوجیوں اور شہریوں کے عزیز و اقارب اور رشتہ داروں جن میں بوڑھے، نوجوان مرد اور عورتیں شامل ہیں، کی مشکلات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔ جو اس انسانی مسئلے کا یہ ایک اہم اور قابلِ غور پہلو ہے۔ اگر ہم اس بات کے خواہش مند ہیں کہ دونوں ممالک کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم ہو جائیں تو پھر بھارت میں مقید پاکستانی شہریوں کی رہائی کو بنیادی اہمیت دینی ہوگی ـــــ!

اگر مذکورہ بالا وجوہات کو بھی قابلِ اطمینان خیال نہ کیا جائے تو پھر اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پاکستان نے بھارت کے تمام جنگی قیدیوں کو رہا کر دیا تھا اور اس سے قبل شیخ مجیب الرحمان کو بھی غیر مشروط طریقہ سے رہا کر دیا گیا تھا۔

میں دنیا کی تمام قوموں بین الاقوامی رائے عامہ سے اپیل کروں گا کہ وہ نظر بند جنگی قیدیوں اور شہریوں کی رہائی کے لئے بھارت پر بھرپور دباؤ ڈالیں۔

سید قائم علی شاہ صدر پاکستان پیپلز پارٹی سندھ کا پیغام

وہ وطن کی خاطر قید ہیں



پاکستان کے بہادر سپوت دشمن کی سرزمین پر اصولوں کی خاطر مقید ہیں۔ وہ وطنِ عزیز کی خاطر قید و بند کی زندگی بسر کر رہے ہیں میں انہیں سلام کرتا ہوں۔

جنگ کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ امن کی راہیں ہموار ہو رہی ہیں۔ ایسی صورت میں پاکستانی جنگی قیدیوں کو نظر بند رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ اخلاقی اور قانونی طور پر بھارت پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ عالمی رائے عامہ کے پیشِ نظر جنگی قیدیوں کو جلد از جلد رہا کر دے۔ میں یہاں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ حکومت پاکستان جنگی قیدیوں کے مسئلہ پر اصولوں کو قربان نہیں کرے گی۔

بھارت اور بنگلہ دیش جنیوا کنونشن کا مذاق اُڑا رہے ہیں

امریکہ اپنے جنگی قیدیوں کی رہائی کیلئے شور مچا رہا ہے اور ویت نام سے اپنی فوج واپس بلانے کی دھمکیاں دے رہا ہے لیکن اس نے پاکستان کے نوّے ہزار جنگی قیدیوں کی رہائی کیلئے کبھی لب کشائی نہیں کی جو کہ گذشتہ پندرہ ماہ سے بھارتی کیمپوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ بھارت اور بنگلہ دیش جنیوا کنونشن کا مذاق اُڑا رہے ہیں اور کھلم کھلا اعلان کر رہے ہیں کہ جنگی قیدی اس وقت تک رہا نہیں کئے جائیں گے، جب تک پاکستان اپنی موت کے پروانے پر دستخط نہیں کر دیتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ صدر نکسن یا امریکہ کے دوسرے حکام نے کبھی بھارت اور بنگلہ دیش کی اس دھاندلی کی مذمت کرنیکی زحمت گوارا کی اور کیا کہ ایک بڑی طاقت ہونیکی حیثیت سے اس پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا ہے کہ وہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق قیدیوں کی رہائی کے لئے بھارت اور بنگلہ دیش پر دباؤ ڈالے اور ایسا کرنے پر مجبور کرے۔ جو بھی شخص انصاف کا بول بالا چاہتا ہے اسے پاکستانی جنگی قیدیوں کی مسلسل نظربندی کی مذمت کرنی چاہیئے



کامریڈ چو۔ این۔ لائی
وزیراعظم عوامی جمہوریہ چین

قیامِ امن کی اولین شرط: جنگی قیدیوں کی رہائی



شیخ الجامعہ ڈاکٹر محمود حسین کا پیغام

بھارت نے پاکستانی جنگی قیدیوں کو ایک طویل عرصہ سے نظربند کر رکھا ہے، ان کی اسیری کسی اور مسئلہ سے زیادہ پاکستان میں بےچینی اور اضطراب پھیلا رہی ہے، یہ ایک فطری امر ہے، جنگ کے خاتمہ کے بعد جنگی قیدیوں کو اتنے طویل عرصے تک روکنے کا کوئی قانونی جواز ہے نہ اخلاقی بین الاقوامی قانون اس سلسلے میں بہت واضح ہے وہ اس امر کی اجازت نہیں دیتا، تمام انسانی اور اخلاقی اقدار بھی اس فعل کی مذمت کرتی ہیں۔ عالمی رائے عامہ بھی، جو اس وقت بھی بھارت کے خلاف نہیں ہوتی تھی جبکہ وہ غلطی پر ہوتا تھا، جنگی قیدیوں کے سلسلے میں بھارت پر نکتہ چینی کر رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام دنیا نے پاکستان کے جائز موقف کو تسلیم کرلیا ہے۔ اگر بھارت اور پاکستان کو امن سے رہنا ہے تو بھارت جتنی جلدی جنگی قیدیوں کو رہا کر دے اتنا ہی اچھا ہے، یہ اقدام دونوں قوموں میں خوشگوار تعلقات کی بحالی میں ایک بڑا کردار ادا کر دے گا !!



بھارت نے جنگی قیدیوں کو رہا نہ کیا تو ایک نئی جنگ ناگزیر ہو جائے گی

اقوامِ متحدہ، امریکہ اور روس کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے

• معراج محمد خان •

دسمبر ۱۹۷۰ء کی پاک بھارت جنگ کو ختم ہوئے تقریباً پونے دو سال ہو چکے ہیں لیکن بھارت کی قید میں پاکستان کے ترانوے ہزار جنگی قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ بدستور اپنی جگہ قائم ہے۔ بھارتی حکمرانوں نے اس اہم مسئلہ پر اپنے سیاسی مفادات اور مقاصد کے لئے جو سرد مہری اختیار کر رکھی ہے اس کے نتیجہ میں دونوں ممالک بتدریج ایک نئے تصادم اور جنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں اگر بھارتی حکمران طبقے اپنی ہٹ دھرمی سے باز نہیں آئے اور انہوں نے فوراً غیر مشروط طور پر پاکستانی جنگی قیدیوں کو آزاد نہیں کیا تو ایشیا اور خصوصاً برصغیر کا امن خطرہ میں پڑ جائے گا اور اس خطہ کے عوام کو ایک نئی جنگ کی تباہ کاریوں کا شکار بننا پڑے گا۔

پاکستان کے عوام قابلِ مبارکباد ہیں کہ انہوں نے اس قدر جذباتی مسئلہ پر اب تک اپنے بے پناہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے لیکن صبر و تحمل کی بھی ایک حد ہوتی ہے چنانچہ پنجاب اور سرحدی صوبہ کے عوام جن کی اکثریت پر ہماری مسلح افواج مشتمل ہیں۔ غم و غصہ کی صورت میں شدید ردِ عمل شروع ہو گیا ہے، جنگی قیدیوں کے خاندانوں سے وابستہ ہزاروں غم زدہ ماں باپ، افسردہ بہنیں و بیویاں، پریشان حال معصوم بچے۔ عالمی رائے عامہ، بین الاقوامی عدالت انصاف، اقوامِ متحدہ اور تمام عالمی قوتوں کے ضمیر کو امن و انسانیت کے نام پر آواز دے رہے ہیں۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے بین الاقوامی عدالت انصاف، امن، آزادی اور برابری کے نام پر قائم ہونے والی اقوامِ متحدہ، بین الاقوامی رائے عامہ اور چین کے علاوہ تمام بڑی عالمی قوتوں کا ضمیر مردہ ہو چکا ہے اور وہ ایک مظلوم، کمزور اور چھوٹی قوم کے اہم انسانی مسئلہ پر اندھی، گونگی اور بہری ہو گئی ہیں۔

بنی نوعِ انسان نے بڑی جد و جہد، تجربہ اور بے مثال قربانیوں کے بعد جنگ کو بھی ایک ضابطہ اخلاق کا پابند کیا ہے جنگی قیدیوں کے متعلق ۱۹۵۵ء کے جنیوا کنونشن کے اصول اور ضابطۂ اخلاق اس کی بہترین مثال ہیں۔ یہ نہایت افسوسناک امر ہے کہ عالمی قوتیں اور طاقتور اقوام عموماً ان ضابطۂ اخلاق کو پامال کرتی رہتی ہیں۔ یہی کچھ اس وقت بھارتی حکمران کر رہے ہیں۔ انیس ماہ گزر جانے کے باوجود بھارت تمام بین الاقوامی قوانین و آداب، جنگی قیدیوں سے متعلق جنیوا کنونشن کے ضابطہ اخلاق اور پاک بھارت جنگ سے متعلق اقوامِ متحدہ کی قرار دادوں کو نظر انداز کر کے پاکستانی جنگی قیدیوں کی رہائی پر ٹال مٹول کر رہا ہے۔ اور نہ صرف یہ بلکہ بھارتی کیمپوں میں ہمارے جنگی قیدیوں پر انسانیت سوز مظالم ڈھائے جا رہے ہیں انہیں پاکستان کے دفاعی اور فوجی راز بتانے نیز ہندوستان کے لئے جاسوسی کرنے پر رضامند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن جب ہمارے غیور محبِ وطن جوان پاکستان کے دفاعی راز بتانے اور مادرِ وطن کے خلاف جاسوسی کرنے سے انکار کر دیتے ہیں تو پھر انہیں ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات انہیں قتل کر دیا جاتا ہے بھارتی حکمران دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے بڑی بے شرمی سے یہ اعلان فرماتے ہیں کہ پاکستانی جنگی قیدی بھارتی کیمپوں میں شر پسندی اور بغاوت کرنے نیز فرار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے مسلح گارڈ کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے۔ اگر بھارتی حکمرانوں کے اس بے نیاز اور غلط مؤقف کو تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی تمام تر ذمہ داری بھارت کی ہی ہے یہ کونسا ضابطہ اخلاق ہے کہ بھارت نہ ہمارے جنگی قیدیوں کو رہا کرے اور نہ ہی ان کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کرے، بھارت کے اس طرزِ عمل کی مذمت کرنا ہر دردمند دل رکھنے والے انسان کا فرض ہے۔

بھارتی حکمران بعض بڑی طاقتوں کے اشارہ اور اپنے سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت ہمارے جنگی قیدیوں کو رہا کرنے کے لئے تیار نہیں۔ صاف الفاظ میں وہ ہمارے جنگی قیدیوں کو پاکستان پر سیاسی دباؤ ڈالنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ پاکستان کے قومی اقتدارِ اعلیٰ اور آزادی کا سودا کر کے اس کو مجبور کر دیا جائے۔ کہ وہ بھارتی شرائط پر تمام تصفیہ طلب مسائل اور تنازعات پر سمجھوتہ کرے اور اس خطہ میں بھارت کی ایک ذیلی ریاست کا کردار ادا کرے۔ بھارت کے ساتھ مل کر عوامی جمہوریہ چین کے خلاف ایک فوجی اور جنگی حصار قائم کرے۔ بھارتی حکمرانوں کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر پاکستانی حکمران بین الاقوامی

بھارت پاکستان کو اپنی طفیلی ریاست بنانا چاہتا ہے

دباؤ میں اگر بھارت کے سامنے گھٹنے ٹیک بھی دیں جب بھی پاکستانی عوام جنگی قیدیوں کو سودہ بازی اور سیاسی دباؤ کے لئے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیں گے اور جنگی قیدیوں کی رہائی تو کیا اگر پوری قوم کو قتل بھی کر دیا جائے تب بھی وہ اپنی آزادی اور جغرافیائی حدود کا سودا نہیں کریں گے۔

تمام اقوام اور خصوصًا بڑی عالمی قوتوں کی یہ اہم ذمہ داری ہے کہ وہ برصغیر پاک و ہند کے مسائل اور ان کی سیاسی نوعیت پر ہمدردی سے غور کریں، روس و امریکہ جیسی دو بڑی عالمی قوتوں کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ اس خطہ میں بھارت اور پاکستان کے درمیان مستقل امن کی خواہاں ہیں لیکن اگر ان دونوں عالمی قوتوں کے کردار کا مطالعہ کریں تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ دونوں ممالک امن عالم کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے بجائے اس علاقہ کے ممالک پر اپنا اثر و رسوخ قائم کرنے اور اس خطہ میں اپنی فوجی، اقتصادی اور جنگی حکمتِ عملی کے لئے سرگرم عمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو یہ قوتیں پاکستان پر اپنا سیاسی دباؤ ڈال رہی ہیں کہ وہ بھارت کی شرائط پر سمجھوتہ کرے اور دوسری طرف یہی بھارت کو کھلے بندوں اقتصادی امداد مہیا کرنے اور اسے مسلح کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ہم کہتے ہیں یوں کیونکر امن قائم ہو سکتا کہ بڑی قوتیں جارح اور مجروح میں فرق کئے بغیر ہی یکطرفہ طور پر پاکستانی عوام پر اپنے فیصلوں کو ٹھونسنے کی کوشش کریں۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ پاکستان کے عوام امن پسند ہیں۔ وہ تمام قوموں اور ملکوں کی آزادی، قومی اقتدار اعلیٰ اور جغرافیائی سرحدوں کا احترام کرتے ہیں وہ کسی بھی ملک کے داخلی معاملات میں بیرونی مداخلت کے مخالف ہیں وہ اقوامِ متحدہ کے چارٹر اور بنڈونگ کانفرنس کے فیصلوں کے سختی سے پابند ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ ایک کمزور قوم اور چھوٹے ملک کو ایک بڑی قوم اور طاقتور ملک کی جارحیت کا نشانہ بنایا جائے۔ اور پھر اسے اپنی آزادی اور قومی اقتدار اعلیٰ کا سودا کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ ہم نہ صرف بھارت بلکہ تمام پڑوسی ممالک کے ساتھ امن و آشتی اور دوستانہ ماحول میں رہنا چاہتے ہیں لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے پڑوسی ممالک بھی ہمارے ساتھ یہی رویّہ اختیار کریں۔ پاکستان کے عوام بھارت کے ساتھ تمام متنازعہ مسائل پر گفت و شنید کرنے اور باعزّت اور پُروقار تصفیہ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن اب بھارت بلکہ دونوں عالمی قوّتوں کو یہ ضمانت دینا پڑے گی کہ بھارت ہماری جغرافیائی سرحدوں اور قومی اقتدار اعلیٰ کا احترام کرے گا اور ہمارے داخلی امور میں مداخلت سے باز آجائے گا۔ لیکن اس تمام امور پر تبادلۂ خیال سے پہلے ہماری شرطِ اولیں یہ ہے کہ بھارت کو مجبور کیا جائے کہ وہ جنیوا کنونشن کے مطابق ہمارے تمام جنگی قیدیوں کو فورًا رہا کرے کیونکہ جنگی قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ پوری قوم کے وقار کا مسئلہ ہے آج پنجاب و سرحد کا ایک ایک گھر کرب والم کی آگ میں جل رہا ہے۔ جب تک اس آگ کو بجھایا نہ جائے گا اس وقت تک اس خطّہ میں دائمی امن کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکتا۔

اس میں شک نہیں کہ جنگی قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ پوری قوم کا اہم ترین مسئلہ ہے لیکن اس سلسلہ میں بیرونی قوتّوں کو موردِ الزام ٹھہرانے کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنی ان سابقہ غلط اور ناعاقبت اندیش پالیسیوں پر بھی بے دردانہ تنقید کرنی چاہیئے جن کی وجہ سے پاکستانی عوام کو یہ اندوہناک دن دیکھنا پڑا کیونکہ جب تک پوری قوم ماضی کی غلطیوں سے سبق نہیں سیکھے گی اس وقت تک نہ پاکستان کا دفاع مکمل ہو سکتا ہے اور نہ ملک ترقی و خوشحالی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

آج پنجابؒ اور سرحد کا ھر گھر رنج و الم میںؒ ڈوبا ھوا ھے!

"کسی ملک و قوم کی جنگی اور دفاعی حکمتِ عملی کا ایک اہم ترین اصول یہ ہے کہ اس ملک کے عوام اور مسلح افواج کی امنگوں، نصب العین اور مقاصد میں کسی قسم کا تضاد اور ٹکراؤ نہ ہو کیونکہ جب بھی کسی ملک کے عوام اور مسلح افواج کے درمیان ٹکراؤ یا تضاد ہو گا اس ملک کی افواج اپنی دفاعی ذمہ داریاں کسی صورت بھی بحسن و خوبی سرانجام نہیں دے سکتی۔"

دسمبر ۱۹۷۰ء کی پاک بھارت جنگ میں مشرقی محاذ پر ہماری عبرتناک شکست کی اصل وجہ یہ نہیں تھی کہ ہماری مسلح افواج کے جوان بزدل تھے یا وہ فنِ جنگ و حرب سے قطعی ناواقف تھے بلکہ مشرقی پاکستان میں ہماری شکست کی اصل وجہ یہ تھی کہ ہمارے حکمران طبقے اور سیاست دانوں نے اپنی مفاد پرستی، ہوس اقتدار کی خواہش اور ناعاقبت اندیش عوام دشمن پالیسیوں کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے سات کروڑ عوام کو اپنے خلاف کر لیا تھا انہوں نے مشرقی پاکستان کے عوام کے فیصلوں کو تسلیم کرنے اور ان کے اقتصادی و سیاسی حقوق بحال کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ بجائے اس کے کہ مشرقی پاکستان کے منتخب نمائندوں کے ساتھ سیاسی اختلاف کو گفت و شنید اور افہام و تفہیم سے حل کیا جاتا انہوں نے مشرقی پاکستان کے عوام کے خلاف مسلح افواج کو ملٹری ایکشن کا حکم صادر کر دیا اور عوام اور مسلح افواج کے درمیان تصادم اور جنگ کی کیفیت پیدا کر کے مسلح افواج کو عوام کی تائید اور حمایت سے محروم کر دیا۔ ہماری مسلح افواج کو نہ صرف بھارتی افواج کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا بلکہ دوسری طرف اپنے ہی باغی عوام سے جنگ کرنا پڑ رہی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا تاریخ میں پہلی بار مسلح افواج کی اتنی بڑی تعداد کو بغیر کسی مداخلت اور مزاحمت کے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

اب بلوچستان میں مشرقی پاکستان کے واقعات کو دہرایا جا رہا ہے، فوجی کارروائی کی جا رہی ہے۔ پوری قوم کا فرض

باقی صفحہ ۵۶ پر

PFUJ

بھارت بڑی طاقت بننے کے خواب دیکھ رہا ہے!



وفاقی انجمن صحافیانِ پاکستان کے
صدر منہاج برنا کا پیغام

چھُٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

* *

جنگی قیدیوں میں تین صحافی بھی شامل ہیں

الفتح کے "جنگی قیدی نمبر" کے لئے پیغام کیا ہو سکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ آپ اور ارشاد راؤ صاحب مبارکباد کے قابل ہیں کہ آپ نے اس نمبر کے ذریعے اس مسئلہ کی اہمیت مزید اُجاگر کی اور ان مساعی میں مقدور بھر حصہ لیا، جو ہندوستان میں محبوس ہمارے جنگی قیدیوں کی رہائی اور واپسی کے لئے کی جارہی ہیں۔

ان جنگی قیدیوں میں ہمارے تین صحافی بھائی بھی شامل ہیں۔ یعنی اے پی پی کے آئی اے خان، الطاف یاور اور روزنامہ "سن" کے داؤد سبحانی۔ یہ تینوں حضرات سقوطِ ڈھاکہ کے وقت مشرقی پاکستان میں موجود تھے اور وہاں اپنے پیشہ وارانہ فرائض انجام دے رہے تھے۔ ہندوستانی حکام نے انہیں بھی فوجیوں کے ساتھ گرفتار کر لیا۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ ہندوستان جنگ بندی کے بعد ان صحافیوں کو فوراً واپس کر دیتا۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ پی ایف یو جے نے اس سلسلہ میں معقول حدود میں جو کچھ ہو سکتا تھا کیا لیکن یہ بات بھی ذہن میں رہی کہ کہیں یہ تاثر پیدا نہ ہو کہ صحافیوں کو صرف اپنے تین بھائیوں سے زیادہ دلچسپی ہے اور دوسرے ہزاروں پاکستانیوں کا خیال نہیں۔

جہاں تک جنگی قیدیوں کے مسئلہ کا تعلق ہے اس معاملہ میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ جنگ بندی کے بعد اتنے عرصہ تک اسیرانِ جنگ کو حراست میں رکھنا نہ صرف جنیوا کنونشن اور دیگر بین الاقوامی قوانین اور اصولوں کے منافی ہے، بلکہ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی ایک غیر انسانی فعل ہے، اور اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ہندوستانی حکمران سخت اذیت پسند واقع ہوئے ہیں۔

ہندوستانی حکمران تو یہ بھی بھول گئے کہ ابھی چند سال پیشتر یعنی ۱۹۶۲ء میں خود ان کے جنگی قیدیوں کے ساتھ ایک ایسے ملک نے جس پر ہندوستان نے حملہ کیا تھا، کیا سلوک کیا تھا۔ دنیا جانتی ہے کہ پنڈت نہرو نے ہند چینی سرحدی جھگڑے کو بزورِ طاقت طے کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اور اپنی فوج کو "بڑھو" کا حکم دیدیا تھا۔ اس کے بعد چینیوں نے ہندوستانی فوج کے وہ دانت کھٹے کئے کہ دنیا دیکھتی رہ گئی ہتھیار ڈالنے والے ہزاروں ہندوستانی فوجی قید کر لئے گئے۔ اور ساتھ ہی بے شمار ہندوستانی اسلحہ، جنگی گاڑیاں اور جیپیں چینیوں کے قبضہ میں آ گئیں۔ لیکن چینیوں نے نہ صرف از خود مفتوح علاقے خالی کر دیئے بلکہ دو تین ماہ کے اندر ہندوستانی حکومت کو مطلع کیا کہ وہ اپنے فوجی بمعہ اسلحہ اور سامانِ جنگ کے واپس لے جائے۔

دنیا جانتی ہے کہ کوئی ہندوستانی قیدی چینیوں کی حراست میں ہلاک نہیں ہوا۔ انہیں بہترین غذا اور دیگر تمام سہولتیں فراہم کی گئیں۔ جن میں پڑھنے لکھنے اور کھیل کود کی سہولتیں بھی شامل تھیں۔

ایک مثال چینیوں کی ہے اور ایک ہندوستانیوں کی۔ فرق واضح ہے۔ اور آخر فرق کیوں نہ ہو۔ ایک صحیح معنوں میں اشتراکی ملک ہے۔ دوسرا اشتراکی لیبل اور دعوؤں کے ساتھ سرمایہ دار ملک۔ اور ایک ایسا سرمایہ دار ملک جو بڑی طاقت بننے کے خواب دیکھتا ہے، اور اسی لئے چھوٹے پڑوسی ملکوں پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔

لیکن اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ کچھ لوگ جن میں ہمارا حکمران طبقہ بھی شامل ہے، اس کوشش میں لگے ہوتے ہیں کہ جنگی قیدیوں کے مسئلہ کو نِرا "انسانی مسئلہ" ہی ثابت کریں اور اس کے متعلق دوسرے مسائل کو بالکل فراموش کر دیں۔ اسی لئے ہندوستان کی حکومت کیطرح ہماری



حکومت بھی یہ کہنے لگی ہے کہ "۱۹۷۱ء کے واقعات سے پیدا ہونیوالے انسانی مسائل حل کئے جائیں"؛

معنوئیہ "۱۹۷۱ء کے واقعات" سے کیا مراد ہے؟ آخر ہم صاف صاف اسے ۱۹۷۱ء کی ہندوستانی جارحیت سے تعبیر کرتے کیوں شرمانے لگے ہیں۔ مانا کہ ہماری کوتاہی ہوتی ہے اور برصغیر میں تعلقات کو معمول پر لانا ہمارے اور سب کے فائدے میں ہے۔ لیکن اس کے لئے بنیادی اصولوں کی تائید سے تو انحراف نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً مسلمہ بین الاقوامی اصولوں کے ماتحت جن میں اقوامِ متحدہ کے منشور اور پنج شیلا کے اصول بھی شامل ہیں۔ اندرونِ ملک حکومتی ردّوبدل کا حق، متعلقہ ملک یا ریاست کے عوام کو ہوتا ہے۔ کسی دوسرے ملک کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرے یا اس پر حملہ اور جارحیت کا مرتکب ہو۔

۱۹۷۱ء میں پاکستان میں جو واقعات پیش آئے وہ اس کے اندرونی معاملات تھے۔ یحییٰ فوجی ٹولے نے نوکر شاہی، فوج اور مغربی پاکستان کے سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کیا اور اپنے مفادات، کے تحفظ کے لئے مشرقی پاکستان پر جو فوج کشی کی وہ یقیناً انصاف، انسانیت، جمہوریت اور خود بنیادی قومی مفادات کے منافی تھی۔ لیکن اس ظلم کو روکنے اور اس کے خلاف پاکستان کے اندر جدوجہد کرنے کا حق بھی پاکستان کے عوام ہی کو پہنچتا ہے۔ نہ کہ ہندوستان کو کہ وہ چند ہزار بنگالیوں کے انخلاء کے نام پر پاکستان پر چڑھائی کر دے اور اسے بنگالیوں کی نجات سے تعبیر کرے۔

اس مسئلے کا ایک تیسرا پہلو وہ افسوس ناک نوعیت کا پروپیگنڈہ ہے جو جنگی قیدیوں کے سلسلے میں گزشتہ چند ہفتوں سے مرکزی وزیر اطلاعات ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے کرا رہی ہے۔ اس پروپیگنڈے کی نوعیت یہ ہے کہ اس میں سوگوار بیویاں آنسو بہاتے ہوئے والدین اور افسردہ بچے دکھائے جاتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ بچے کہتے ہیں کہ "ابو کب آئیں گے"۔ اس نوع کے پروگراموں کے ذریعہ شکست خوردگی، مایوسی اور قنوطیت کے جذبات عوام الناس میں پیدا کئے جا رہے ہیں۔ عموماً ریڈیو اور ٹی۔وی پر جن قیدیوں کی بیویوں یا والدین کے انٹرویو نشر کئے جاتے ہیں وہ بیشتر فوجی افسر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں مایوسی اور عدمِ اعتماد کا پہلو غالب ہوتا ہے۔ اگر ہماری وزارتِ اطلاعات کے سربراہان عام جنگی قیدیوں اور عام فوجی سپاہیوں کے اہل و عیال سے بھی رجوع کریں تو مجھے یقین ہے کہ ان کی باتیں زیادہ جاندار اور باوقار ہوں گی۔ افسروں کی بیویوں کے انٹرویو کی تعداد اتنی ہی ہونی چاہیئے جتنی فوج میں سپاہیوں کے مقابلہ میں افسروں کی تعداد ہوتی ہے۔

ایک آخری پہلو جو اس مسئلہ سے متعلق ہے وہ بہت گھمبیر ہے اور اس پر مجھے وہ پرانا زبان زدِ عام شعر یاد آتا ہے کہ

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا
نہ پھول تھے، نہ چمن تھا، نہ آشیانہ تھا

واقعی جب یہ ترانوے ہزار قیدی واپس آئیں گے تو اپنے ملک میں بڑی تبدیلیاں دیکھیں گے۔ پہلے تو یہی کہ ان کا چمن اگرچہ باقی ہے لیکن نصف رہ گیا ہے۔ عام لوگ انتہائی مشکلات کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ۱۹۷۱ء کے مقابلہ میں ضروری اشیاء کی قیمتیں پچاس سے سو فیصد تک بڑھ چکی ہیں۔ نیا وفاقی جمہوری اور اسلامی دستور نافذ ہوگیا ہے۔ لیکن بنیادی حقوق معطل کر دیئے گئے ہیں۔ دفعہ ۱۴۴ کی حکمرانی ہے۔ بلوچستان میں منتخب حکومت برطرف کر دی گئی ہے، اور وہاں فوج کارروائیاں کر رہی ہے۔ بلوچ لیڈر گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ سیلاب میں ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد کے گھر بہہ گئے ہیں۔ اور وہ اپنے وطن میں بے گھر ہو گئے ہیں۔ جن میں شاید ان قیدیوں کے گھر بھی شامل ہوں۔

ان قیدیوں کو اپنی واپسی پر یہ بھی معلوم ہوگا کہ انہوں نے جس پارٹی کو کثرت سے ووٹ دیئے تھے وہ برسرِ اقتدار ہے۔ لیکن اپنے منشور اور پروگرام سے انحراف کر چکی ہے۔ اسی پارٹی کی حکومت میں دو مرتبہ کراچی کے مزدوروں پر اس وحشیانہ طور پر گولی چلائی گئی کہ جس کی مثال اس سے پہلے ہمارے ملک کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان قیدیوں کو اپنی واپسی پر یہ بھی معلوم ہوگا کہ روٹی، کپڑا، مکان اور سوشلزم کے جو خواب انہیں دکھائے گئے تھے وہ سب ایک دھوکہ تھے۔ انہیں آنے کے بعد یہ بھی معلوم ہوگا کہ جہاں ان کی چند پرانی خوش فہمیاں اور غلط فہمیاں دور ہو گئی ہیں اور چند چھوٹے بڑے دھوکوں کا سحر ٹوٹا ہے وہاں اب نئے دھوکے اور نئے فریب پیدا کئے جا رہے ہیں۔ کچھ مذہب کے نام پر پرانے دھوکے چل رہے ہیں۔ کچھ تحریکوں کے نام پر نئے دھوکے تخلیق ہو رہے ہیں۔

واپسی پر قیدی سوچیں گے کہ ان کا دیس کتنا بدل گیا ہے اور پھر بھی کتنا کم بدلا ہے۔

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا!



متحدہ مزدور فیڈریشن سندھ کے صدر عثمان بلوچ کا پیغام

بھارت اور بنگلہ دیش کا محنت کش طبقہ جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے جدوجہد کرے

میں اپنے خیالات کی ابتدا مشرقی پاکستان کے بہادر اور جیالے ساتھیوں، مزدوروں اور غریب عوام سے کروں گا جنہیں ظلم و جبر اور استحصال کا شکار بنایا گیا۔ متحدہ پاکستان کے عوام کے خلاف سرمایہ داروں، جاگیرداروں، نوکر شاہی، رجعت پسندوں اور اقتدار پسند ٹولے کے درمیان ہمیشہ گٹھ جوڑ رہا۔ اس لعنت زدہ ٹولے کا پاکستان کے دونوں بازوؤں پر اسی حد تک کنٹرول تھا کہ مشرقی پاکستان کی معیشت کو بالخصوص تباہ کیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے عوام کو محکوم سمجھا گیا۔ مشرقی خطہ ارض کو نوآبادیاتی تصور کیا جاتا رہا۔ جمہوریت کا گلا اس قدر دبایا گیا کہ ہر محب وطن اور ایماندار آدمی کی آواز کو ایک غدار کی آواز سمجھا جانے لگا۔ مشرقی پاکستان میں حالات خراب ہونے لگے تو مفاد پرستوں نے سیاسی حل کی جگہ فوجی قوت کے بل پر معاملات کو سلجھانا چاہا۔ جس سے حالات مزید ابتر اور سنگین ہو گئے۔ ان تمام بنیادی اسباب کا پتہ لگانے کی بجائے مغربی پاکستان کے مزدوروں اور کسانوں کے بچوں کو جو فوج میں بھرتی ہو کر ملک کی سرحدوں کا دفاع کرنا چاہتے تھے انہیں غریب عوام کو دبانے اور کچلنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں ترانوے ہزار فوجیوں کو بھارت کا قیدی بننا پڑا اور جو آج بھی بھارتی فوجی کیمپوں میں اس جرم کی سزا بھگت رہے ہیں جس میں ان کی اپنی مرضی کا دخل نہیں تھا۔

آج ہماری وہ مائیں، بہنیں، بہوئیں اور بیٹیاں جو جنگی قیدیوں سے منسلک ہیں، دعا اپنے بھائیوں، بیٹوں اور شوہروں کی راہ تک رہی ہیں۔ یقیناً اس بے چارگی کا گناہ بھی اسی سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ اور لوٹ کھسوٹ کے نظام کہنہ اور اس کے کارندوں کے کندھوں پر ہے۔ ایسے لوگ انسانیت کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر اقتدار اور عیش کے ایسے نشہ میں جھوم رہے ہیں جس میں انسانیت کا احترام جاتا رہتا ہے۔ بربریت کی اس حد تک جا پہنچتے ہیں، جہاں انسانیت کی جبین مقدس سرنگوں ہو جاتی ہے، جہاں تخلیق کے سوتے پھوٹنے سے پہلے خشک ہو جاتے ہیں۔

پاکستان کا مزدور، پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش اور دنیا کے تمام دانشوروں، قانون دان طبقہ، شعرا، اساتذہ، طلباء اور بالخصوص انقلابی طبقوں سے امید کرتا ہے کہ وہ پاکستان کے ان تمام فوجیوں، جو غدار، سامراجی ایجنٹ اور تعیش پسند آمر اور اس کے حواریوں کی پالیسی، اور ناعاقبت اندیشانہ احکامات پر عمل کر کے بھارتی کیمپوں میں محصور ہیں۔ ان کی رہائی اور ظالمانہ نظام کے خلاف متحرک ہو کر، انسانیت کے وقار کو بلند کرنے میں پیش پیش نظر آئیں گے۔

شیرِدل، حوصلہ مند، صابر اور ثابت قدم

ہمارے ہزاروں، بلند ہمت بھائی سرحد کے پار، جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں ہر لمحہ مثالی صبرو ثابت قدمی
کے ساتھ جابرانہ قید کی اذیت اور دُکھ جھیل رہے ہیں۔ جارحیت کی گولیوں سے اُن کے
سینے چھلنی ہیں۔ لیکن ہمارے جوانمردوں نے ظلم و ناانصافی کی تاریکیوں میں یقین،
محبتِ وطن اور ایثار و قربانی کی شمعیں روشن کر رکھی ہیں۔

رنج و آزمائش کے گہرے سایوں میں اُن کے بچھڑے عزیزوں، کے دم اور حوصلہ سے اُمید و یقین کی
شمعیں فروزاں ہیں۔ انتظار کی گھڑیوں میں یہ اہلِ وطن بے نظیر استقامت کے ساتھ مصائب
کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہم اُن کے ساتھ دست بدُعا ہیں کہ انتظار کی صبر آزما
گھڑیاں بہت جلد ختم ہو جائیں۔

ہم اپنے ۹۰ ہزار بھائیوں کی مردانگی، جرأت و دلیری کو خراجِ عقیدت پیش کرتے
ہیں۔ ہماری دُعا ہے کہ وہ بہت جلد وطن واپس آ کر اپنے عزیزوں سے آملیں۔

کامرس بینک لمیٹڈ

کامیاب حضرات کے لئے کامیاب بینک

CBL-10-73 ASIATIC

اَج آکھاں وارث شاہ نُوں

امرتا پریتم



اَج آکھاں وارث شاہ نُوں کِتے قبراں وِچوں بول !
اتے آج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول

اِک روئی سی دھی پنجاب دی تُوں لکھ لکھ مارے وَین
اَج لکھاں دِھیاں روندیاں تینُوں وارث شاہ نُوں کہن

اُٹھ دردمنداں دے دردیا اُٹھ تک اپنا پنجاب
اَج بیلے لاشاں وِچھیاں تے لہو دی بھری چناب

کِسے نے پنجاں پانیاں وِچ دِتی زہر رَلا
تے اوہناں پانیاں دَھرت نُوں دِتا پانی لا

اِس زرخیز زمین دے لُوں لُوں پھُٹیا زہر
گِٹھ گِٹھ چڑھیاں لالیاں پھُٹ پھُٹ چڑھیا قہر

وہ وِسی دا پھیر لے وَن وَن وگی جب
اوہنے ہر اِک والن دی وَنجھلی دِتی ناگ بنا

ناگاں کیلے لوک مُونہہ بس پھر ڈنگ ای ڈنگ
پلو پلی پنجاب دے نیلے پے گئے انگ

گلیوں ٹُٹے گیت پھر، تُو کلیوں ٹُٹی تند
ترنجنوں ٹُٹیاں سہیلیاں، چرخڑے گھُوکر بند

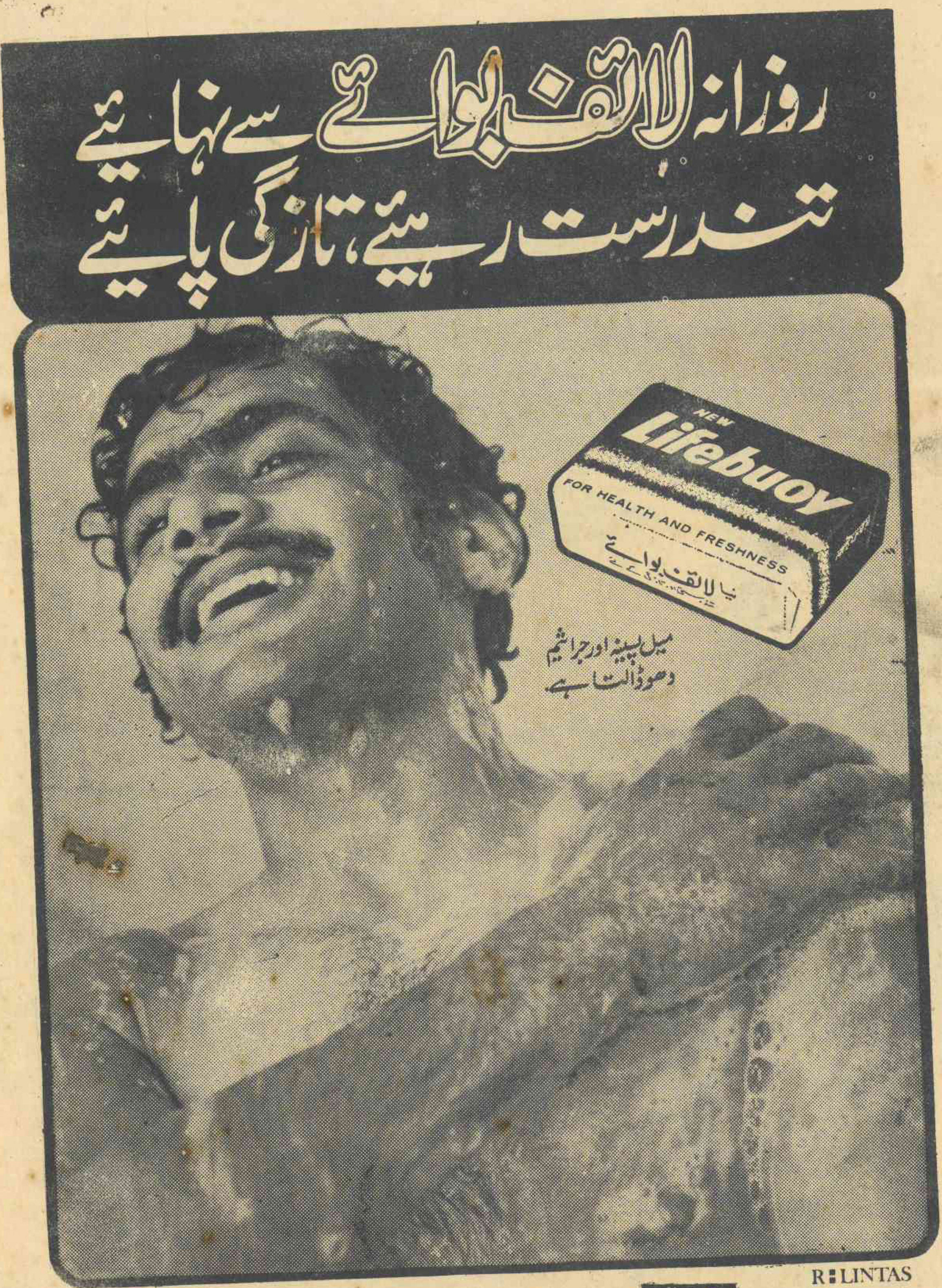
سنے سیج دے بیڑیاں لُڈن دِتیاں روہڑ
سنے ڈالیاں پینگھ اَج پپلاں دِتی توڑ

جتھے وجدی سی پھُوک پیار دی اوہ وَنجھلی گئی گواچ
رانجھے دے سب وِیر اَج بھُل گئے اِس دی جاچ

دھرتی تے لہو وسیا ، قبراں پئیاں چون
پریت دِیاں شہزادیاں اَج وِچ مزاراں رون -

اَج سبھے کیدو بن گئے، حسن عشق دے چور
اَج کِتھوں لیایئے لبھ کے وارث شاہ اِک ہور

اَج آکھاں وارث شاہ نُوں کِتوں قبراں وِچوں بول
تے اَج کتاب عشق دا کوئی اگلا ورقہ پھول



روزانہ لائف بوائے سے نہائیے
تندرست رہیئے، تازگی پائیے
NEW
Lifebuoy
FOR HEALTH AND FRESHNESS
نیا لائف بوائے
میل پسینہ اور جراثیم
دھو ڈالتا ہے۔
R:LINTAS

سچائی کی آواز



جنیوا سبھا کا — یہ فرمان ہے
جو فی الواقعہ — عدل کی جان ہے
کہ یکدم — لڑائی ٹھہرنے کے بعد
تباہی کی رو — ختم کرنے کے بعد
لڑائی میں پکڑے ہوئے عسکری
سلاسل میں جکڑے ہوئے عسکری
حراست کی ڈوری سے — آزاد ہیں
اہم اور مہمان — افراد ہیں!



سید الحمید عاصم

مخالف حکومت کا یہ — فرض ہے
شرافت کی اقدار کا — قرض ہے
کہ وہ اپنے مہمان — افراد کو
معزز — اسیران آزاد کو
بعزت گھروں کو — روانہ کرے
یہ دانشوری — عاجلانہ کرے
بصد قدر و توقیر و آداب ہو
بہت جلد رخصت — عمل یاب ہو

مگر کیا یہی — قدرِ قانون ہے
مناسب ہے برحق — موزون ہے؟
مگر کیا یہی — طاعت حکم ہے
یہ کیا دھاندلی ہے — یہ کیا ظلم ہے؟
کہ پوری طرح — جنگ بندی کے بعد
مکمل — حقیقت پسندی کے بعد
برس سے زیادہ — گزرنے کو ہے
تحمل کا ہر ظرف — بھرنے کو ہے
مگر نورِ امید — مفقود ہے
اجالے کی ہر راہ — مسدود ہے
ہمارے دلیر اور بہادر جواں!
مسلط ہیں جن پر — کڑی سختیاں

جہاں تھے — پڑے ہیں ابھی تک وہیں
کوئی واپسی کی — نشانی نہیں

نہ باغی نہ مُفسد — نہ جاسوس ہیں !
تو پھر کس خطا میں — وہ محبوس ہیں !

تم انسان ہو — وہ بھی انسان ہیں
عزیزوں کی خوشیوں کا — ارمان ہیں

یہ ارفع گھرانوں کے — چشم و چراغ
ہیں کس جرم میں — خوار و خستہ دِماغ

یہ ماؤں کے بیٹے — یہ بہنوں کے وِیر
مُعزّز — بہادر — درخشاں ضمیر

جنہیں قید رکھنے کا — مجرم جواز
ہے دشمن کا اِک — حربۂ خانہ ساز

رہیں گے تنکارِ ستم — تا کجُا!
عزیز و اقارب سے دُور اور جُدا

ہے دنیا کے دانشوروں کی پُکار
یہ برتاؤ ہے — منفی و نابکار

یہ توہین ہے — عقل و تہذیب کی
جہاں سوز بھٹّی ہے — تخریب کی

یہ دورِ جہالت کا — برتاؤ ہے
یہ بھالا نہیں — بس بھرا گھاؤ ہے

درندوں کے مسلک کی — تصویر ہے
شرافت کی گردن پہ — شمشیر ہے

خدا کے لئے — اتنا سوچو ذرا
کسی طور بھی — ظلم ہے یہ روا

ہزاروں گھرانے — کلپتے رہیں
ہزاروں کلیجے — سُلگتے رہیں

اگرچہ دلاور — گھرانے ہیں وہ
جری وارثوں کے — ٹھکانے ہیں وہ

توکّل کے — آئینہ دار ہیں
امُید و یقین — صبر و ایثار ہیں

کشادہ نظر — حوصلہ مند ہیں
خدا کے بھروسے پہ — خورسند ہیں

مگر یہ تو انصاف کا خون ہے
یہ کس اندھی نگری کا — قانون ہے

کہ وہ دائمی اِبتلا میں — رہیں
المناک صبح و مسا میں — رہیں

کسی مُلک کے — باحمیّت عوام
ہیں اس ملک کی — آبروئے دوام

اُٹھو ہند کے عام طبقو — اُٹھو
بہیمانہ گھاتوں کو روکو — اُٹھو

تمہاری گذشتہ روایات پر
حق و عدل کی — محترم ذات پر

تعصب — رذالت — سیہ سوچ کا
نہ ہو جائے دھبّہ کوئی — رُونما

اٹھو — انسدادِ مظالم کرو
حکومت کو — مجبُور و نادِم کرو

کہ مذموم طرزِ عمل — چھوڑ دے
ہمارے سپاہی — ہمیں موڑ دے



جنگی قیدی اور ادیب • قدرت اللہ شہاب

۹۰ ہزار زندہ لاشوں پر ادیب کی آنکھ کیوں بے نم ہے

پچھلے دنوں لاہور میں ایک مذاکرہ ہوا جس میں ادیبوں اور دانش وروں سے احتساب کرنا مقصود تھا، کہ انہوں نے ہمارے جنگی قیدیوں کے ضمن میں کیا تاثر قبول کیا ہے، اور اپنے احساسات کو اظہار جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے۔ یہ محاسبہ جائز تو ہے لیکن اسے آج سے بہت پہلے شروع ہونا چاہیئے تھا۔ اس سلسلے میں میرے جیسے نیم ادیب کا بھی ایک نقطۂ نظر ہے، جسے بیان کرنا بھی غیر واجب نہیں۔

جنگی قیدیوں کا مسئلہ درحقیقت اس عظیم المیئے کا شاخسانہ ہے جو دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان کی سرزمین پر رونما ہوا یہ سارا مسئلہ اب تک اتنی داخلی اور خارجی پیچیدگیوں، احتیاطوں، احتجاجوں اور متصادم احتجاجوں کے گرداب میں گرفتار ہے، کہ اس پر ادیب کا ردِ عمل بھی اب تک آزادی سے ابھر نہیں پایا۔

ایک حکایت ہے کہ بسطام میں ایک آتش پرست حضرت بایزید بسطامیؒ کے پاس آیا جایا کرتا تھا اور ان کا وعظ بڑے ذوق و شوق سے سنا کرتا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تم جو اس قدر عقیدت سے شریکِ محفل ہوتے ہو، آخر مسلمان ہی کیوں نہیں ہو جاتے ؟ آتش پرست نے جواب دیا کہ اگر اسلام وہ ہے جو بایزیدؒ میں پایا جاتا ہے تو میں اس کی طاقت نہیں رکھتا، اور اگر وہ ہے جس کا نمونہ تم ہو تو یہ میرے لئے باعثِ ننگ ہے۔

اس آتش پرست کی طرح غالباً آج کا ادیب بھی یہ کہنے پر کسی قدر حق بجانب ہوگا کہ جنگی قیدیوں کے المیے پر اگر ردِ عمل وہ ہے جو ان کے زندہ در گور ماں باپ، اداس بھائیوں بہنوں، منتظر بیویوں اور پریشان بچوں میں پایا جاتا ہے تو لاریب ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ اور اگر وہ ہے جو بساطِ سیاست پر ہر روز نت نئے روپ دھار کر عوام الناس کے ذہن پر ابتری، گندگی، انتشار اور الجھن کے گرد آلود جھکڑ چھوڑتا ہے تو یہ ہمارے لئے باعثِ ننگ ہے۔

لیکن پھر ایک اور سوال اٹھتا ہے، اگر ہمارا ادیب ہیروشیما اور ناگاساکی پر برافروختہ ہوتا ہے، اگر اس کے اعصاب برصغیر کی تقسیم کے فسادات پر انسان کی بربریت سے شل ہو سکتے ہیں، اگر الجیریا کی مظلوم مجاہدہ جمیلہ اس کے دل کے تار ہلا سکتی ہے، اگر یروشلم کی شکست اس کے عرفان میں دیوار گریہ اٹھا سکتی ہے، اگر ویت نام کی جنگ سے اس کی تخلیقی صلاحیت میں ہیجان پیدا ہو سکتا ہے تو پھر سقوطِ ڈھاکہ پر خاموشی کی اوس کیوں پڑی ہوئی ہے ؟ نوّے ہزار بے گور و کفن زندہ لاشوں پر ادب کی آنکھ کیوں بے نم ہے ؟

میرے خیال میں اس کی وجہ ادیب کی بے حسی نہیں، بلکہ اس کی بے بسی ہے۔ اس کی بہت سی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ اوّل تو جنگی قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ مسلم بنگال کے ساتھ ہمارے آئندہ تعلقات کی نوعیت سے یوں الجھا ہوا ہے جس طرح کاغذ کی ناؤ بھنور کے محیط میں پھنس کر چکر کاٹ رہی ہو۔ یہ معاملہ ابھی تک دوٹوک اور قطعی طور پر طے نہیں ہوا، بلکہ بدستور نزاعی ہے۔ مستقبل میں مسلم بنگال کے ساتھ ہمارا رابطہ ابھی فیصلہ کن نہیں بلکہ فیصلہ طلب ہے۔ بیرونی دنیا میں اس مسئلہ پر جو ابتدائی تفریق تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ بڑی تیزی سے کم سے کمتر ہوتی جا رہی ہے۔ لیکن خود پاکستان کے اندر یہ فیصلہ ابھی تک متضاد جذبات اور متصادم سیاست کی دو دھاری شمشیرِ بے نیام کی نوک پر معلق ہے۔ یہ تلوار یوں بھی انوکھی انداز سے وار کرتی رہی ہے کہ یہ سارے کا سارا مسئلہ اپنی قومی سطح سے کٹ کر انفرادی یا زیادہ سے زیادہ جماعتی ٹکڑیوں میں بٹ گیا ہے۔ اس بات پر ساری



قوم میں ایک جھجک پائی جاتی ہے کہ جنگی قیدیوں کو جلد از جلد رہا ہونا چاہیئے۔ اس بات سے بھی کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک نہ ایک روز مشرقی پاکستان یا مسلم بنگال یا بنگلہ دیش کے ساتھ ہمارا کسی نہ کسی قسم کا رابطہ قائم ہونا لازمی ہے۔ دِلّی اور ڈھاکہ کے ملی بھگتوں کی ضد نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ جب تک دوسری بات طے نہیں پا جاتی جنگی قیدیوں کی رہائی میں ایک رکاوٹ کے بعد دوسری رکاوٹ بدستور پڑتی چلی جائے گی۔ یہ رویہ ناواجب ہٹ دھرمی کی منہ بولتی ہوئی مثال ہے۔ کیونکہ جنگی قیدی انسانی

ہمارا ادیب مصلحتوں کے شیش محل میں پناہ لیکر بیٹھ گیا

مسئلہ ہیں اور بنگلہ دیش ایک سیاسی سوال، ان دونوں کو پاکستان کے خلاف زور ازوری کی سیاست میں گڈ مڈ کرنا نہ دِلّی کو زیب دیتا ہے نہ ڈھاکہ کو۔ لیکن ان سے کوئی اور امید رکھنا بھی بیکار ہے۔

اس کے برعکس ہم جنگی قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ تو بیک زبان کرتے ہیں لیکن مسلم بنگال کے سوال پر یہی یک زبانی بھانت بھانت کی بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ان بولیوں کے سُر اور تال بھی وقت اور موسم کے حساب سے ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ آج کی رائے کل کی تردید اور کل کا بیان پرسوں کی تائید میں منتقل ہو جاتا ہے۔ ایک سیاسی مسئلہ پر موقفات اور خیالات کی یہ متلون مزاجی اور تغیر پذیری اس کے انسانی پہلو پر بھی لازمی طور پر بڑی شدّت سے اثر انداز ہو رہی ہے۔ چنانچہ ڈیڑھ برس کے اندر اندر اب یہ نوبت آگئی ہے کہ اگر جنگی قیدیوں کے حق میں جلسے کرتی ہیں تو ان کی سوگوار بیویاں، اور جلوس نکالتے ہیں تو ان کے اداس بچے۔ باقی معاشرہ انتہائی خیر سگالی سے سڑک کے دو رویہ کھڑے ہو کر ان کا نظارہ کرتا ہے۔ ہمدردی جتاتا ہے۔ قیدیوں کی رہائی میں تاخیر پر لب بات لبست وکشاد کو برا بھلا کہتا ہے۔ اور پھر گھر جا کر اپنے روزمرہ کے مشاغل میں معروف ہو جاتا ہے۔ جلسے جلوس کو چھوڑ کر باقی کسی وقت یہ مسئلہ معاشرے کا اجتماعی المیہ بن کر قوم کی نیند حرام نہیں کرتا۔ بلکہ یہ محض اُس ماں، اُس بہن، اُس بیوی، اُس بچے کا انفرادی المیہ بنا رہتا ہے، جنہیں کئی ہفتوں سے ریڈ کراس کے ذریعے ان کے قیدی جوان کا خط ہندوستان کے زندان خانے سے موصول نہیں ہوا۔

ادیب کا فرض تھا کہ وہ اس بات کا نوٹس لیتا کہ ملک کے اندر اور باہر سیاسی تنازعات کا اژدہا ایک انسانی مسئلے کو جلنے میں جکڑی ہوئی بے بس بکری کی طرح نگلنے کو جا رہا ہے، لیکن نہ قوم کے کان پر جوں رینگتی ہے اور نہ ہی دنیا کا ضمیر ٹس سے مس ہوتا ہے۔ لیکن بیچارہ ادیب بدحواس ہو کر چوک گیا۔ اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ عوامی ذہن پر آج کل خطابت اور صحافت کا راج ہے اس نقار خانے میں ادیب کی آواز طوطی سے بھی زیادہ نحیف ہے۔ آزادی کے بعد وطنِ عزیز میں ادب نے اپنے لئے ایسا مقام پیدا نہیں کیا کہ وہ سیاست، صحافت ثقافت یا تجارت کی طرح سارے ماحول پر نہ سہی زندگی کے کسی ایک پہلو پر ہی پوری طرح اثر انداز ہو سکے۔ ۲۵ برس میں ہمارے ادب میں ایک بھی منصور نہیں اُٹھا جو انا الحق کا نعرہ لگا کر دار پر چڑھنے کے لئے تیار ہو۔ اس کوتاہی کا اندازہ ادیب کو خود بھی ہے۔ اس احساس نے اس کو ایک پوشیدہ ذہنی جھینپ اور اندازِ عذر خواہی میں مبتلا کر کے اس کے جنون

کی وہ بے باکی چھین لی ہے جس کی کوکھ سے زمانے کا رُخ بدلنے والا ادب تخلیق ہوتا ہے۔ اس نفسیاتی مجبوری میں دب کر ہمارا ادیب اپنی مصلحتوں کے خود ساختہ شیش محل میں پناہ لے کر بیٹھ گیا۔ اور اس کی زیادہ توجہ اس احتیاط پر لگ گئی، کہ کہیں کوئی دوسرا اس کے گلاس ہاؤس پر پتھراؤ نہ کرنے پائے۔ ہمارے ہاں جس آسانی سے ہر کس و ناکس پر طرح طرح کے جماعتی و نظریاتی لیبل چسپاں کرنے کا رواج ہے، ادیب اس سے بہت خائف ہے۔ وہ تو بزعم خود آفاقی قدروں کی علمبرداری کا وارث ہے۔ وہ کیسے گوارہ کر سکتا ہے کہ وہ اپنے فن کو روزمرہ کی سیاست اور صحافت کی زد میں ڈال کر قومی مسائل کی آگ میں بے خوف و خطر کود پڑے۔ اس ہچکچاہٹ نے ہمارے ادیب کو قومی سیاق و سباق میں بے اثر اور عضو معطل بنا کے رکھ دیا ہے۔ محتاط ادیب زیادہ تر محتاج ادب ہی پیدا کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان کی بحرانی تاریخ کے نازک ترین سال ۱۹۷۱ء کے دوران یا اس کے بعد ہمارے ادیب نے کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا۔ دوسری طرف ہمارے ادیبوں کے درمیان ایک ایسا طبقہ بھی ضرور موجود ہے جو ہر قسم کی لے دے اور ہر طرح کا لیبل لگنے کے باوجود پوری دُھن اور دھیان کے ساتھ اپنے لائحہ عمل پر نہایت مستعدی اور ثابت قدمی سے کام کر رہا ہے۔ یہ "چار قومیے" دانش وروں کا ٹولہ ہے۔ جو اپنی دُم میں باہر سے آئے ہوئے مور کے پَر لگا کر بڑی دیدہ دلیری سے کوّے کی چال چلتا ہی رہتا ہے۔ کاش ہمارے محب وطن ادیب اپنے ان دانشور بھائیوں سے جرأت رندانہ کا کم از کم اتنا ہی سبق سیکھ لیتے کہ لیبل تو آنی جانی چیز ہے۔ آج لگے کل اُتر گئے۔ جو شے زندہ اور با اثر رہتی ہے وہ فن کا خلوص، بیان کی سچائی اور نصب العین کی راستی ہے، اگر آج بھی ہمارا ادیب اپنی ہچکچاہٹ کے خول اور احتیاط کے تابوت سے باہر نکل آئے تو قوم کے ہنگامی مسائل پر شاید اس کا فانوسِ خیال روشنی کی کوئی تازہ کرن ڈال سکے۔

اس سلسلے میں ہندوستان کے ادیبوں کی روش پر بھی ایک نظر ڈالنا بے محل نہ ہوگا۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، اپندر ناتھ اشک، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی جیسے حساس ادیب آج بھی وہاں موجود ہیں۔ بنگال میں

شوکت عثمان اور جسیم الدین کیوں خاموش ہیں؟

قحط پڑے تو "ان داتا" جنم لیتا ہے۔ تقسیم ہند پر فسادات ہوں تو کبھی "ہم وحشی ہیں" کا نعرہ بلند ہوتا ہے۔ کبھی "پشاور ایکسپریس" "سردار جی" "میں کون ہوں" "دھانی بانکیں" اور "اجنتا" جیسے ادب پارے تخلیق ہوتے ہیں۔ لیکن جب انہی فنکاروں کے آس پاس نوّے ہزار زندہ در گور انسان پڑے ایڑیاں رگڑ رہے ہوں، تو ان کی انسان دوستی کو کون سا سانپ سونگھ جاتا ہے؟ ان قیدیوں کے لاکھوں عزیز و اقارب آس و یاس کی سولی پر لٹکے ہوتے ہوں تو ان کے دل کے آبگینے پتھر کی کنکریاں کیوں بن جاتی ہیں؟ پاکستان کا ادیب تو اپنی قومی احتیاطوں اور بین الاقوامی نزاکتوں کی وجہ سے کسی قدر معذور ہے کیا ہندوستان کا ادیب بھی اپنے ملک کی طرح اپنی جارحانہ فتح مندی کے نشے میں مسرور و مخمور ہو چکا ہے؟ اگر ایسا ہے تو انسانیت کے ترازو میں ہماری مجبوریوں کا عجز ان کے سرکاری درباری پندار پر ہزار درجہ بھاری ہے۔

اس ضمن میں ان ادیبوں اور دانشوروں کا تذکرہ بھی ضروری ہے جو ڈھاکہ، چٹاگانگ، راجشاہی، میمن سنگھ میں آج بھی بقید حیات ہیں۔ ہندوستانی ادیب ان کی زندگی کا کوئی شعور نہیں رکھتے لیکن ہمارے ساتھ ان کا رشتہ بڑا گہرا تھا۔ وہ منیر چودھری تو قتل ہو گیا، جس نے لسانی فسادات کے بعد ڈھاکہ میں پہلا اردو مشاعرہ اپنی ذاتی نگرانی میں منعقد کروایا تھا۔ لیکن شوکت عثمان تو زندہ ہے، جس نے پاکستان کا دورہ کر کے اپنا شاہکار "ہیکڑ اُملک" (ایک ملک) لکھا تھا۔ آج ہم کو کیسے پتہ چلے کہ اب وہ ایک کی جگہ دو ملکوں کی داستان کس قلم سے لکھ رہا ہوگا؟ کوی جسیم الدین بھی ڈھاکہ میں موجود ہے۔ ہم اس کی گائے کے لئے گھاس کی ٹوکریاں خرید کر اپنے کندھوں پر لاد کر اس کے گھر "پلاشش باڑی" لے جایا کرتے تھے۔ اس کے باغیچے میں اگر ایک پھول بھی ہوا کے جھونکے سے ٹوٹ کر گر جاتا تھا، تو جسیم الدین کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپکنے لگتے تھے۔ اب ہمیں کون بتائے کہ نوّے ہزار انسانوں کی صعوبتوں پر اس کا دل پتھر ہے یا موم؟ پاکستان رائٹرز گلڈ نے مشرقی پاکستان کے شہر شہر میں اس قسم کے سینکڑوں قلبی رابطے اور ذہنی پل تعمیر کر رکھے تھے، ان پُلوں کو نہ ہندوستان کے ٹینک مسمار کر سکتے ہیں نہ شیخ مجیب الرحمٰن کی تکتی باہنیاں۔ ان رشتوں اور رابطوں کو اگر کوئی توڑ سکتا ہے تو وہ گزرے ہوئے وقت کا بے رحم ہاتھ ہے۔ اگر وقت کا کارواں یوں ہی بے مقصدی، بے یقینی اور سرد مہری سے چلتا رہا تو کل ہم اُس سرزمین کے ادیبوں اور دانشوروں کے لئے اتنے ہی اجنبی ہو جائیں گے جتنے اجنبی ہندوستان کے ادیب آج وہاں ہیں۔

پاکستان کا ادیب اپنے ارباب سیاست سے یہ سوال پوچھنے کا حق رکھتا ہے کہ کیا وقت کے کدال کو واقعی اتنی مہلت دینا چاہتے ہیں کہ وہ ان ذہنی پُلوں کو کھود کر مسمار کر ڈالے جو سالہا سال کی محنت، محبت، نفرت، صلح اور لڑائی کے اینٹ گارے سے ہم نے اسلام آباد اور ڈھاکہ، کراچی اور چٹاگانگ، لاہور اور راجشاہی، ملتان اور کھلنا، پشاور اور میمن سنگھ، کوئٹہ اور سلہٹ کے درمیان تعمیر کر رکھے تھے؟

جنگی قیدیوں کا مسئلہ قومی سطح سے کٹ کر انفرادی یا جماعتی بن گیا!



جنگی قیدیوں کے بارے میں پاکستانی ادیبوں کے تاثرات

اوتاروں کے دیس میں راشی دندناتے پھر رہے ہیں

ہندوستان نے ہزاروں سیتاؤں کے رام چرا لئے !!

حضرت جوش ملیح آبادی

بول اِک تارے جھن جھن جھن جھن
سب کی جھولی میری جھولی
سب کی ٹولی میری ٹولی
سب کی ہولی میری ہولی
سب کی بولی میری بولی
سب کا جیون میرا جیون
بول اک تارے جھن جھن جھن جھن
سارے جگ کے ڈیرے دل میں
سب کے ہیرے پھیرے دل میں
دنیا بھر کے گھیرے دل میں
سارے دل میں میرے دل میں
سب کی دھڑکن تیری دھڑکن
بول اِک تارے جھن جھن جھن جھن
سب کے کاجل میرے تارے
سب کی آنکھیں میرے تارے
سب کی سانسیں میرے دھارے
سارے انسان تیرے ہمارے
ساری دھرتی میرا آنگن
بول اِک تارے جھن جھن جھن جھن

یہ آلاپ آپ کو اس لئے سنا دیا کہ آپ کو میری آواز میں ایک متعصب آدمی کا دھوکہ نہ ہو۔ سو ایک آفاقی اور انسان دوست آدمی کی حیثیت سے میں تمام دنیا کے ضمیر سے بالعموم اور اپنے ہندوستان کے ضمیر سے بالخصوص یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اے مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو پر ناز کرنے والے ہندوستان آخر تجھ کو کیا ہو گیا ہے کہ تو پاکستان کے ہزاروں انسانوں کو جنگی قیدیوں کا لیبل لگا کر بھیڑوں اور بکریوں کی طرح کٹہرے میں بند کئے ہوئے ہیں، اور انہیں رہا کرنے کا نام تک نہیں لیتا۔ تو سیاست کے اکھاڑے میں اتر چکا ہے۔ سیاست کا میدان یادش بخیر رشیوں، مونیوں اور اوتاروں کا میدان تھا۔ لیکن اب اس پر ہر تفس سیاستدان دھاندلی کرتا بعض ہو چکے ہیں۔ اوتار چلے ہیں اور اس میدان میں راشی دندناتے ہوئے پھر رہے ہیں۔ اے ہندوستان تجھ کو یہ احساس تک نہیں کہ تو نے جن دکھیاروں کو قید کر رکھا ہے، ان کی بیویاں بھی ہیں، بچے بھی ہیں۔ مائیں بھی ہیں اور بہنیں بھی ہیں۔ اور تجھ کو یہ اندازہ نہیں کہ تو خون کے دھارے میں کشتی کھے رہا ہے۔ اے میرے جواہر لال نہرو کی بیٹی تو میری بھتیجی ہے۔ میں نے تیرا لڑکپن بھی دیکھا تھا اور تیری جوانی بھی — دیکھ بیٹی ہزاروں دلوں کے ٹوٹنے سے ہاتھ اٹھا لے۔ تو عورت ہے، تیرے سینے میں ماں کا دل دھڑک رہا ہے۔ تجھے ان قیدیوں کی ماؤں، بہنوں، بیویوں اور بچوں پر رحم کیوں نہیں آتا۔ اے اندرا ہزاروں ماؤں، بہنوں کا دل نہ توڑ۔ ہزاروں عورتوں کا سہاگ نہ برباد کر۔ ہزاروں معصوموں کو ان کے باپوں کی زندگی میں یتیمی کے درد میں مبتلا نہ کر۔ تجھ کو اندازہ نہیں کہ کتنے معصوموں کے منہ اتر چکے ہیں۔ کتنی ماؤں کی کوکھیں اجڑ چکی ہیں۔ کتنی چوڑیوں نے کھنکھنا چھوڑ دیا ہے۔ کتنے ہار مرجھا چکے ہیں۔ کتنی انگنائیوں میں خاک اڑ رہی ہے۔ کتنے گھر بھائیں بھائیں کر رہے ہیں۔ کتنی ہتھیلیوں کی مہندی مدھم پڑ چکی ہے۔ اور کس قدر صبحیں ویران پڑی ہوئی ہیں۔ ہائے جب برکھا کی گھٹائیں رم جھم پڑتیں اور کوئلیں کوکتی ہیں، تجھے پتہ نہیں کہ کتنی سہاگنیں کتنی برہا کی ماری سہاگنیں چیخ اٹھتی ہیں کہ بدرا گھر گھر آئے ؛ ساجن کو ساتھ نہ لائے اور اے بھارت تجھ کو پتہ نہیں کہ کتنے بدرا کے راگ، کتنے کوکوں کی آگ، کتنے یتیموں کی آہیں ؛ کتنے بیوں کی کراہیں، تیرے گرد ایک مدت سے فریاد کر رہی ہیں۔ لیکن عورت ہو کر بھی تیرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ راون نے رام کی سیتا کو چرایا تھا تو نے ہزاروں سیتاؤں کے رام چرا لئے ہیں، اور اے میرے ہندوستان کے جلیل القدر ادیبو۔ فنکارو۔ شاعرو تم منہ میں گھنگھنیاں بھرے کیوں بیٹھے ہو، اس ناانصافی کے خلاف نعرے کیوں نہیں لگاتے۔ ادیبوں اور شاعروں کے دل تو موم سے بھی زیادہ نرم ہوتے ہیں، مگر تم نے اپنے دلوں کو شاید پتھر بنا لیا ہے کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ مجھ کو اس بات کا خوف ہے کہ شاعری کی دیوی کہیں تمہارے سروں سے اپنا سایہ نہ اٹھا لے۔ اور پھر اے ہندوستان تیری جانب رخ سخن موڑ کر یہ کہتا ہوں کہ تو اگر اس دھاندلی سے ہاتھ نہیں اٹھائے گا تو تیرا ظلم خود تجھ کو جلا کر راکھ میں تبدیل کر دیگا۔ غریبوں کی آہیں ادھر ادھر نہیں جایا کرتیں۔ میری التجا سن کر اے میرے ہندوستان پسیجے گا یا نہیں اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو میں تیری دیرینہ شرافت کے متعلق یکسر رائے بدل دوں گا اور یہاں تک کہ خود انسان سے اس قدر بدظنی پیدا ہو جائے گی کہ میں اس کو اس دنیا کا سب سے زیادہ شقی حیوان سمجھنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔

کاٹ دے زنجیریں کاٹ دے
ظلم کی خندق پاٹ دے
ناانصافی کی کلائی مروڑ دے
اور قیدیوں کو چھوڑ دے
تجھ کو مجھ سے زیادہ یہ بات معلوم ہے
کہ ناؤ کاغذ کی سدا چلتی نہیں
ظلم کی ٹہنی کبھی پھلتی نہیں



بھارتی حکومت نے اپنے دل کو پتھر کر لیا

ہم وہاں کے ادیبوں سے انصاف کے طالب ہیں

—— فیض احمد فیض ——

ہم لوگ جو ادیب قلم کار یا فنکار کہلاتے ہیں، ہم لوگ جن کے پاس نہ طبل علم ہے نہ ملک و ملّی جو صرف محبت کرنا اور اپنا دل جلانا جانتے ہیں۔ ہم، جنہیں دعویٰ ہے کہ سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ ہم اپنے اپنے دیس میں بستے ہیں اور اپنی اپنی قوم کا بھلا چاہتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی دنیا والوں کی نظر میں ہماری ایک عالمگیر برادری بھی ہے جس کا دل ہر دکھی کے ساتھ دکھتا ہے اور ہر سکھی کے ساتھ خورسند ہوتا ہے۔ یہ دکھ سکھ جسے یہ مختلف حکومتوں کی سیاسی مصلحتوں سے واسطہ ہے نہ سیاسی جماعتوں کے مخصوص تقاضوں سے ہمارے اپنے ضمیر اور اپنے دل و دماغ کی تخلیق ہوتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اگر ساتھ کے گھر میں کوئی ماں، کوئی باپ، کوئی بیٹی، کوئی بہن دکھ درد سے کراہ رہی ہو اور ہم اس کی طرف سے اپنا دل پتھر کر لیں۔ اس وقت پاکستان میں کوئی نوے ہزار گھرانے ایسے ہیں جن میں ان گنت مائیں، بہنیں، بیویاں سال بھر سے ان بچھڑے ہوئے عزیزوں کے فراق میں اشکبار اور سوگوار ہیں، جو اس وقت ہمارے ہمسایہ ملک کی اسیری میں ہیں۔ ان میں سے کچھ اسیروں کی خطا یہ ہے کہ وہ اپنے حکام کے کہنے پر ایک دردناک معرکے میں شریک ہوئے، اور کچھ کا قصور محض اتنا ہے کہ وہ ان ہنگاموں کے دوران ایک ایسے دیس میں مقیم تھے جسے وہ اپنے وطن کا حصہ سمجھتے تھے اور ان کی اسیری کے سبب سے مصیبتوں کے پہاڑ ایسی مخلوق پر ٹوٹے ہیں جو قطعی بے خطا اور بے گناہ ہیں۔

اس سال بھر سے ہم پاکستان کے ادیب اور فنکار اپنے دکھوں کے ساتھ ان فرقت زدوں کے داغ اٹھاتے دل بھی اپنے دل میں لئے پھرتے ہیں۔ اور آج یہی داغ اپنی سرحدوں کے اس پار اپنی برادری کے ہم نفسوں کو دکھانا چاہتے ہیں۔ اور ان سے مداوا میں انصاف کے طالب ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ بھارت میں بھی انفرادی طور پر ہر صاحب دل میں اس بے جواز اور بے وجہ درد و الم کی تلافی کا خواہاں ہو گا جن کے سائے ان قیدیوں کی طویل اسیری کے باعث ہمارے گلی کوچوں اور کھیتوں کھلیانوں پر منڈلا رہے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ انفرادی طور پر اس تعدی کے خلاف احتجاج بھی کیا ہو۔ اپنی حکومت اور ارباب اختیار کو انصاف اور انسانیت کے نام پر ان اسیروں کی رہائی پر آمادہ کرنے کی کوشش بھی کی ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ ابھی تک یہ صدائیں صدا بصحرا سے زیادہ موثر ثابت نہیں ہوئیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ برادری یک زبان ہو کر جماعتی طور سے یہ تقاضا کرے کہ ان مصیبت زدوں اور ان کے عزیزوں کو اس ابتلا سے نجات دلائی جائے۔ بعض اوقات حکومتیں اپنی مصلحتوں کی بناء پر اپنے دل کو پتھر اور اپنے ضمیر کو بہرہ بھی کر لیا کرتی ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے دل اور ضمیر کو بیدار کرنا فنکاروں اور دانشوروں ہی کی ذمہ داری ہوا کرتی ہے۔ بھارت میں اس برادری کے اتنے کثیر اور مقتدر افراد موجود ہیں کہ اگر وہ چاہیں تو اس ذمہ داری سے یقیناً عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

●

بھارت نے جنگی قیدیوں کو بازار سیاست کی جنس بنا دیا

—— احمد ندیم قاسمی ——



ابھی چند روز پہلے میں نے ایک اخباری کالم میں بھارت کے اہل قلم سے ایک سوال پوچھا تھا۔ میں نے ان سے عرض کیا تھا کہ دسمبر کی جنگ کے نتیجے میں جب پاکستان کے ترانوے ہزار فوجی اور شہری قیدی جن میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہیں، بھارت کے کیمپوں میں منتقل کر دیئے گئے تو اسے میری سادہ لوحی یا انسانیت کی قدروں پر میرا ناقابل شکست اعتماد کہہ لیجئے کہ دو تین مہینے کے اندر مجھے ان قیدیوں کی واپسی کا یقین تھا۔ میرے سامنے جینوا کنونشن کے وہ اصول تھے جنہیں بھارت سمیت دنیا کے تمام مہذب ممالک تسلیم کر چکے تھے، اور جن کے تحت جنگ بندی کے فوراً بعد قیدیوں کی واپسی شروع ہو جاتی ہے۔ پھر میرے سامنے بھارت کے وہ اہل قلم اور اہل فن تھے جو اپنی تحقیقات میں کسی ایک لمحہ غیر منصفانہ قید پر بھی بلک بلک کر رو دیتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اپنے وطن کی سرزمین پر ترانوے ہزار قیدیوں کو ضرورت سے ایک دن بھی زیادہ محبوس دیکھ کر وہ من حیث الجماعت

ہند کے اہلِ قلم کہاں ہو آواز دو!

بلبلا اٹھیں گے کہ آخر یہ کیا انسان کشی ہے۔ اور بھارتی حکومت اپنی مملکت کے اصول فراموش کرنے پر کیوں مصر ہے مگر آج تک میرے کانوں میں بھارت کی کسی ادبی شخصیت کی طرف سے اس قسم کی کوئی آواز نہیں پہنچی تھی۔ پھر بھارتی کیمپوں میں پاکستان کے نہتے فوجیوں کو گولیوں سے بھون ڈالا گیا مگر بھارتی شعر و فن کے افق پر احتجاج کی ایک بدلی بھی نمودار نہ ہوئی۔

اس کے بعد جب مصدقہ اطلاعات موصول ہوئیں کہ بھارت میں پاکستانی جنگی قیدیوں کو جسمانی اور ذہنی اذیتیں دی جاتی رہی ہیں۔ اور وہاں ایک ایسا کیمپ بھی قائم ہے، جس میں قیدیوں سے فوجی راز اگلوانے اور ان کے نظریات و اعتقادات بدلنے کے لیے ان کے ساتھ نہایت وحشیانہ اور ظالمانہ سلوک روا رکھا جا رہا ہے تو میں نے سوچا کہ کیا بھارت کے اہلِ قلم کا ضمیر اب بھی چپکا رہے گا؟

امریکہ اور ویت نام کی جنگ سے زیادہ خوفناک جنگ اس کرۂ ارض پر کیا لڑی گئی ہوگی کہ ان کے درمیان معاہدۂ امن کے فوراً بعد قیدیوں کو رہا کیا جا رہا ہے۔ میں نے پوچھا تھا کہ کیا بھارت کے اہلِ قلم نے اخبار پڑھنا ترک کر دیا ہے۔ اور اگر یہ خبریں پڑھتے ہیں تو کیا ان کے قلب و ذہن میں کوئی دھماکہ نہیں ہوتا۔ نازی اور فاشی کیمپوں میں اس طرح کے واقعات کے بارے میں سنا تھا مگر بھارت فاشسٹ کہلانے کو تیار ہے۔ ڈھکوسلا یہ گھڑا گیا کہ پاکستانی فوجوں نے بھارت اور بنگلہ دیش کی مشترکہ کمان کے سامنے ہتھیار ڈالے تھے مگر کیا ایسا کہہ دینے سے پوری دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکی جا سکتی ہے جبکہ ۱۱ ستمبر ۱۹۷۱ء تک بنگلہ دیش کی فوج کا کوئی وجود نہ تھا۔ میں نے کہا تھا کہ یہ صاف اور صریح دھاندلی ہے اور اگر میری آواز بھارت کے اربابِ شعر و فن اور اہلِ علم و ادب تک پہنچ سکے تو میں انسانیت کے نام پر ان سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ کم از کم یہ تو بتائیں کہ ان کا ضمیر کیا کہتا ہے۔ انکے انسانیت کے معیار کیا ہیں۔ ان کے اصول و انصاف کا کیا فیصلہ ہے۔؟ ترانوے ہزار پاکستانیوں کے بھارت کی قید میں

چلے جانے کے آج پندرہ مہینے بعد ایک بالواسطہ قسم کی خبر پاکستان میں پہنچی ہے کہ بھارت کے ادیبوں کے ایک بڑے وفد نے اپنی وزیر اعظم سے ملاقات کی اور ان سے پاکستانی قیدیوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔ بڑے اطمینان کی بات ہے کہ بھارت کے ادیبوں نے سوا برس بعد۔

جس طرف دیکھنا تھا، اب اس طرف دیکھا ہے۔

اب میں ان سے یہ نہیں پوچھوں گا کہ وہ اتنے عرصے تک کیوں خاموش رہے۔ اب میں ان سے یہ عرض کروں گا کہ اہلِ قلم سیاسی انداز میں ایک مطالبہ کر کے اپنے فرائض سے سبکدوش نہیں ہو جایا کرتے بلکہ اس مطالبے کو اس کے منطقی نتیجے تک



پہنچا کر دم لیتے ہیں۔ ترانوے ہزار جنگی قیدیوں کا سوا برس تک بھارت کے کیمپوں میں محبوس رہنا ایسا معمولی واقعہ نہیں ہے کہ مستقبل کا بھارتی مورخ بھی اس بارے میں خاموش رہنے کی جسارت کر سکے گا۔ اس قسم کے واقعات قوموں کے اخلاقی معیار کی کسوٹی ہوتے ہیں۔ بھارت اس کسوٹی پر کھرا نہیں اترا مگر کیا بھارتی اہلِ قلم اس کھوٹ کو اسی طرح چپ چاپ برداشت کرتے چلے جائیں گے جیسے انہوں نے مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں اپنی حکومتوں کے غیر جمہوری طرزِ عمل پر خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اور ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستان کے خلاف بھارت کی ننگی جارحیت کی باقاعدہ تائید کرتے رہے اور دسمبر ۱۹۷۱ء کی جنگ میں انہیں اہلِ مشرقی پاکستان کا حقِ خود اختیاری تو دہ رہ کر یاد آتا مگر انہوں نے اہلِ کشمیر کے حقِ خود اختیاری کو گزشتہ ۲۵ برس سے گول کر رکھا ہے۔

میرے مخاطب بھارت کے سبھی اہلِ قلم ہیں۔ مگر میں حقیقت کے ساتھ اردو کے فراق گورکھپوری، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، علی سردار جعفری، خواجہ احمد عباس، جیلانی بانو، واجدہ تبسم، ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطان پوری وغیرہ پنجابی کے امرتا پریتم۔ بربھ جوت کو موہن سنگھ اور درشن سنگھ آوارہ وغیرہ کے سے فن کاروں سے مخاطب ہوں۔ ان میں بعض نے آل انڈیا ریڈیو کی نشریات میں ہم پاکستانی ادیبوں سے خطاب فرمایا تھا، اور ہم سے والہانہ اظہارِ محبت کیا تھا۔ میں محبت کے اس جذبے کی قدر کرتا ہوں مگر یہ نکتہ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرحدوں کو بے معنی قرار دینے اور پاکستان اور بھارت کی مشترکہ تاریخ مشترکہ تہذیب اور مشترکہ کلچر کی رٹ سے وہ پاکستان کے سیاسی نظریے پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ ہم سے ان کا اظہارِ محبت پاکستان کی نفی کا پہلو لیے ہوتا ہے۔ بھارت کے اہلِ قلم اور اہلِ علم نے ادب و دانش کے میدان میں یقیناً بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں۔ مگر وہ قیامِ پاکستان کی عظیم تاریخی خصوصیات کے لئے اب تک اپنے ذہنوں میں گنجائش پیدا نہیں کر سکے۔ اور سارا پانی یہیں مر رہا ہے۔ ہم محبت کے جذبات کی قدر کرتے ہیں۔ مگر لہجے میں چھپی ہوئی تلوار کی کاٹ کو محسوس کر سکتے ہیں۔

ہمارے وطن اور ہمارے نظریے اور ہماری تہذیب کا احترام کرتے ہوئے ہم سے محبت کیجیے تو جواب میں آپ کو ایسی محبت ملے گی جو سراسر دیانت ہوگی۔ امن اور سکون کے ہم پاکستانی اہلِ قلم بھی شیدائی ہیں۔ بلکہ ہمیں تو امن اور سکون کی ساری دنیا کے مقابلے میں سب سے زیادہ ضرورت ہے خود

اسیروں کی فوری رہائی انسانیت کا تقاضہ ہے

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم



بھارت نے ہم پر جو ستم توڑے ہیں اس کا ملبہ ہٹانے کے لئے بھی ہمیں بے فکری اور سکون کی فضا درکار ہے۔ ہم امن پسند ہیں مگر باعزت امن چاہتے ہیں۔ ہم جنگ پسند نہیں ہیں کیونکہ جنگ ہمارے خوابوں کی تعبیروں کو بھی جھلسا سکتی ہے۔ اور ہمیں اپنے خواب بہت عزیز ہے۔ مگر امن کا پیغام جارحانہ نہیں منصفانہ ہونا چاہیئے۔ اور انصاف وہ جنس ہے جس کی کم سے کم پاکستان کے معاملے میں تو بھارتی حکمرانوں کے یہاں شدید کمی ہے۔ اس کا ایک ثبوت ترانوے ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں کی بے معیاد اسیری ہے۔ اور ان کے جیتے جاگتے انسانوں کو بازارِ سیاست کی جنس بنا کر مہنگے داموں فروخت کرنے کی سفاکانہ ذہنیت ہے۔ میں ان اہلِ قلم سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ انسانیت کے پلڑے میں اپنا وزن ڈالیں اور اس وزن کو محسوس کرائیں آپ وہ لوگ ہیں جنہیں دعویٰ ہے کہ آپ کو ہر ملک کا انسان بحیثیت انسان عزیز ہے۔ آپ کو حق وانصاف کی عالمگیر قدریں عزیز ہیں۔ آپ کو نیکیاں اور خوبصورتیاں عزیز ہیں۔ میں آپ سے صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ قول کی حد تک تو یہ دعوے یقیناً بہت پیارے ہیں اور انسان کے ہزارہا برس کی مسلسل قربانیوں کے بعد یہی کچھ کمایا ہے۔ مگر جب کوئی قول تشنۂ عمل رہ جائے تو وہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ اور یہ دعویٰ تو ایک چھوٹا آدمی بھی کر سکتا ہے کہ میں سچ ہوں۔

کتنا اچھا مقولہ ہے۔

" شناختِ خدا، ابتدائے دانش است۔"

یعنی عرفانِ حق ہی علم کی ابتدا ہے۔ قدرت نے حقِ انسانی فطرت میں ودیعت کیا ہے۔ اور یہی فطری عطیہ جب جذبے کی صورت میں اُبھرتا ہے تو انسانی آنکھیں اس حقیقت کو تلاش کرنے میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ یہ جستجو اور حق کی پہچان دراصل انسان کا اپنا عرفان ہے۔ یہی عرفانِ حق علم کی ابتدا بھی ہے اور علم کی انتہا بھی۔

حق کی بات جب اظہار وبیان کے حسین روپ میں ڈھلتی ہے تو فن اور ہُنر اُبھرتے ہیں۔ فنکار حق کا پرستار ہوتا ہے۔ اور پرستار ہی نہیں ہوتا اس کا مجسم اظہار ہوتا ہے۔ حق کی آواز کسی ایک فردِ واحد یا کسی گروہ یا جماعت کی آواز نہیں ہوتی، یہ انسانیت کی آواز ہوتی ہے۔ اس انسانیت کی آواز کو بلند کرنے کے لئے ہمت اور قوت درکار ہے۔ لیکن علم ودانش اور ہُنر وفن اس قوت وتوانائی کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ فردوسی نے اس حقیقت کو اپنے مخصوص پُر زور الفاظ میں یوں آشکار کیا۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا۔ ع

توانا بود ہر کہ دانا بود

فضا کتنی افسردہ اور ماحول کتنا مکدر نہ ہو فنکار کا قلب بیدار رہتا ہے۔ اس کی نظریں اور دوررس احساس تیز تر ہو جاتا ہے۔ جب عام لوگوں کی آوازیں دب جاتی ہیں تو اس کی روح سے حق وصداقت کی آواز اُبھرتی ہے۔

یہ حق وصداقت کی آواز آج ایک ناچیز فنکار کے دل سے اُبھر رہی ہے۔ اور اس احساس سے اُبھر رہی ہے کہ ہمارے ہمسایہ ملک میں رہنے والے فنکاروں، ادیبوں اور دانشوروں کے کان اس کے سننے کے لئے بیدار ہوں گے۔ ان کی آنکھیں اس حقیقت کو زیادہ وقت نظر سے دیکھیں گی۔ اور ان کی دانائی اور دانشوری کو توانائی زیادہ زور اور قوت سے آمادہ کار ہو جائیگی۔

دو بے جان چیزیں بھی قریب رہتے ہوئے کبھی کبھی آپس میں ٹکرا جاتی ہیں۔ اور انسان تو پھر انسان ہے۔ قوت وحرکت کا نشان۔ انسان، انسان سے اُلجھ جاتا ہے اور پھر خود راہِ راست پر آجاتا ہے۔ اگر خود یہ نہ کرے تو دانشمند بزرگ سمجھا بجھا کر دوستانہ ملاپ کی صورت نکال لیتے ہیں۔

پاکستان اور بھارت کا ٹکراؤ ہوا اور دونوں ہمسائے سنبھل گئے۔ بگاڑ دور ہوا اور حالات کو سازگار بنانے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ لیکن بھارت میں جنگی قیدیوں کا مسئلہ ابھی تک حل ہونے میں نہیں آیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جنگی قیدیوں کی رہائی ایک لازمی امر ہے۔ یہ صرف عدل وانصاف کی بات نہیں، حق وصداقت کی بات ہے۔ یہ انسانیت کا تقاضا ہے۔ حق وصداقت کسی مصلحت کے پابند نہیں۔ حق تو خود سب سے بڑی مصلحت ہے۔ اسے کسی مصلحتی سہارے کی ضرورت نہیں۔

صوفی تبسم اپنے پرانے ہمسائے ادیبوں، دانشوروں اور فنکاروں کے احساس سے غافل نہیں۔ وہ جانتا ہے کہ اس کے قدیم دوست اور عقیدت مند اپنے فرائض کو خوب سمجھتے ہیں۔ اور ان فرائض کو ادا کرنے پر آمادہ ہیں بلکہ اس ضمن میں سلسلہ جنبانی بھی کر چکے ہیں، لیکن اس کام کو کسی ایک ہنگامی اقدام تک محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے لئے مسلسل جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔

صوفی تبسم کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ ہمارے ہمسائے دانشور اور فنکار نہ صرف جنگی قیدیوں کے حالِ زار سے آشنا ہیں بلکہ ان کے بچوں عزیزوں اور دوستوں کے دلوں کی دبی ہوئی فریادوں کو بھی سنتے ہوں گے۔ اور ان کے دل درد والم سے مضطرب ہوں گے۔

صوفی تبسم کے یہ چند الفاظ اپنی نحیف آواز کو اپنے دوستوں کے کانوں تک پہنچانا ہیں۔ اور اس حق وصداقت کی داد دینا اور اسے تیز تر کرنا ہے۔

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ

الفتح

کراچی

ایڈیٹر
وہاب صدیقی

جلد ۔ ۴
شمارہ ۔ ۱۵
فون:-
۴۱۲۲۷۴

۲۳ - ۳۰ اگست ۱۹۷۲
قیمت ، ایک روپیہ
ہوائی ڈاک سے ایک روپیہ ۵۰ پیسے

فہرست



ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۸۔ڈی، نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی سے شائع کیا

جنگی قیدی

قتیل شفائی



خط جب آتا ہے کوئی ہند کے زندانوں سے
جھانکتی ہیں کئی آنکھیں مری سرہانوں سے

مَیں اکیلا مگر مجھ میں ہے رشتوں کا ہجوم   میرے چہرے پہ ہیں کتنی ہی دعائیں مرقوم
کتنے سر ہیں کہ جو سجدے میں گھرے ساتھ مرے   کتنی روحوں کے نمائندہ ہیں دو ہاتھ مرے
آن ملتے ہیں کئی دل مرے ارمانوں سے !!
خط جب آتا ہے کوئی ہند کے زندانوں سے

یوں کھلے ہوتے ہیں الفاظ میں یادوں کے گلاب   چوم کر ان کو ملے جیسے نگاہوں کو ثواب
یوں جھلک جاتا ہے قرطاس پہ جذبات کا رنگ   جس طرح چاند نکلنے پہ حسیں رات کا رنگ
نور اُمڈتا نظر آتا ہے قلمدانوں سے !
خط جب آتا ہے کوئی ہند کے زندانوں سے

خط کو پڑھ کر مجھے اکثر یہ خیال آیا ہے   سنگدل میرے لئے کیوں مرا ہمسایہ ہے
سوچتا ہوں کہ یہ پتھر کا زمانہ تو نہیں !!   جنگلوں میں ہمیں پھر لوٹ کے جانا تو نہیں !
کوئی دیتا ہے صدا مجھ کو بیابانوں سے
خط جب آتا ہے کوئی ہند کے زندانوں سے

پوچھنے والے میں اک بات بتادوں تجھ کو   بے خبر ہوں مگر اتنی سی خبر ہے مجھ کو !
چیل بیداد کی جس ملک پہ منڈلاتی ہے   فاختہ امن کی اس ملک سے اڑ جاتی ہے
خون کی بو مجھے آتی ہے گلستانوں سے
خط جب آتا ہے کوئی ہند کے زندانوں سے

ارتقا پر ہیں نئے ذہن، مہذب ہے سماج   ہو چکا ختم زمانے سے غلامی کا رواج !
کوئی ذلت پہ رضامند نہیں ہو سکتا   اب کسی کا کوئی پابند نہیں ہو سکتا
مَیں تصور میں الجھتا ہوں ستم رانوں سے
خط جب آتا ہے کوئی ہند کے زندانوں سے

وقت کہتا ہے کہ جاگا ہے زمانے کا ضمیر   لوٹ آئیں گے وہ غازی وہ مجاہد وہ اسیر
سر کٹاتے ہیں جو میدان میں وطن کی خاطر   مسکراتے ہیں جو زندان میں چمن کی خاطر
آج تک جن کو گزارا گیا طوفانوں سے
آملیں گے وہ نئے دَور کے انسانوں سے

ملن کے ایام آرہے ہیں

فاروق حمادی

(اپنے جنگی قیدیوں کے نام)

میرے وطن کے عظیم فرزندو
دستِ سفاک کے اسیرو
تم اپنی دھرتی کی آبرو ہو
فضائیں سونی ہیں بن تمہارے
ہواؤں میں وہ نشہ نہیں ہے
ہمکتے پھولوں سے مہکے آنگن
ہیں زرد پتوں کی وحشتیں ہیں!
گلاب سے چہرے بجھ گئے ہیں
جو آنکھیں خوشیوں کی بستیاں تھیں
گھٹائیں بن کر برس رہی ہیں
سماعتوں کے ہیں خالی کاسے
اداس در دستکوں کے پیاسے
محبتوں کے شگفتہ پھولوں کی
اجڑے جوڑوں کو آرزو ہے

○

بہادر! شیر دل سپوتو!!
ہر ایک لب کی دعا تمہی ہو
ہر ایک سینے کی دھڑکنیں ہو
ہر آنکھ میں اشک بن گئے ہو
ہر ایک دل میں بسے ہوئے ہو
وہاں جو ٹوٹے ہیں حشر تم پر
یہاں قیامت گزر گئی ہے!
جو شعلے تم کو جھلس رہے ہیں
اس آگ میں ہم بھی جل رہے ہیں
شگاف ہیں جان و تن تمہارے
ہمارے دل بھی لہو لہو ہیں
کہ ایک ہی جسم ہے ہمارا
کہ ایک ہی جان ہے ہماری
کہ ایک کنبے کے فرد ہیں ہم
کہ ایک ہی خون ہے ہمارا
کہ ایک منزل کے ہم ہیں راہی
کہ ایک ہی ہے سفر ہمارا
اگرچہ تم دور ہو بظاہر
دلوں سے لیکن جدا نہیں ہو!

○

میرے عزیزو! میرے رفیقو
شبِ الم ڈھل چکی ہے پیارو
سحر کے آثار ہیں ہویدا!!
خزاؤں کا ابر چھٹ گیا ہے
جدائی کے دن گزر گئے ہیں
ملن کے ایام آرہے ہیں!
وہ فصلِ گل مسکرا رہی ہے
مسرتوں کے دریچے کھولو
گھروں میں آکر کرو چراغاں
تم آؤ پھر آفتاب بن کر
کہ تیرہ شہر دل میں روشنی ہو
بجھے دلوں کے کنول کھلاؤ!
بہار بن کر چمن میں آؤ!
وصال بن کر گلے لگاؤ!!
خوشی کے نغمات گنگناؤ



دیکھنا یہ ہے کہ۔۔

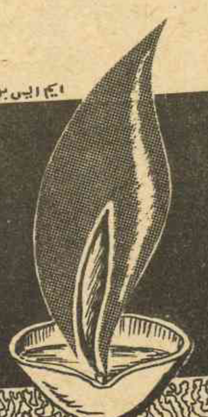
احمد فراز

آج اغیار کے تیروں سے بدن پر میرے
پھر وہی زخم چمکتے ہیں ستاروں کی طرح
پھر اُسی دشمن جاں دشمن دیں کے ہاتھوں
میرا ملبوس ہے گل رنگ بہاروں کی طرح
پھر میرے دیس کی مٹی سے لہو رستا ہے
پھر در و بام ہوئے سینہ فگاروں کی طرح
میرے دشمن، میرے قاتل نے ہمیشہ کی طرح
پھر یہ چاہا کہ شکستہ میرا پندار کرے
جس طرح رات کا سفاک شکاری چاہے
کہ وہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرے
یا چراغِ سرِ دیوار کو تنہا پا کر
جس طرح تند ہوا لوٹ کے یلغار کرے

میرے دشمن نے یہ سوچا ہی نہیں تھا شاید
یہ دیا بادِ صبا سے بھی بھڑک سکتا ہے
اس کو قوت پہ تکبر ہے مگر مجھ کو یقین
دستِ حق بازوئے قوت کو جھٹک سکتا ہے
جانے کس زعم میں آیا تھا مقابل میرے!
وہ اندھیروں کا پجاری، وہ اجالے کا عدو
اس نے ایک مشعلِ تاباں کو بجھانا چاہا!
اور فضا میں لپک کر اٹھے ہیں کروڑوں بازو
میرا مشرق ہو کہ مغرب میرے سارے اطراف
میری قوت، میرا پیکر، مری جاں میرا لہو

دیکھنا یہ ہے کہ اس باطل و حق کے رن میں
رات مرتی ہے کہ زنجیرِ سحر ہوتی ہے
کل نئی صبح میری ہے میرا ایمان ہے یہ
جس طرح ڈوبتے سورج کو خبر ہوتی ہے
مَیں تو سَو بار اُسے اپنا مقدر کر لوں
جس شہادت سے مری ذات اَمر ہوتی ہے

ایم ایس بھٹی





جمیل الدین کے نام
لطیف پریشان
کا ایک خط

نجانے کتنے سینے گولیوں سے چھلنی کر دیئے گئے

پھر اُمنگیں، آرزوئیں ہیں دلوں میں بے قرار
قوم کو یاد آ گیا۔ اپنا گم شدہ وقار

محترمی و مکرمی!! سلام و نیاز!!

"میرے نغمے تمہارے لئے ہیں" کے خالق کا "میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے" سنا!! میرے محترم بزرگ! تلخیاں کا خالق کسی وقت (ابھی نہیں) کہتا رہا ہے۔

یہ جنگ اور میرے وطن کے شوخ جواں خریدی جاتی ہیں اُٹھتی جوانیاں جن کی

لیکن نہ "تلخیاں" والا تلخیاں محسوس کرتا ہے۔ نہ ہی بیدی اور نہ ہی عباس! انہیں انسانی ہمدردی کا صرف دعویٰ ہی تھا۔ حقیقت میں ایسا نہ تھا۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ بیسویں صدی میں محض سیاسی مصلحتوں کی بناء پر انسانی المیوں سے اتنے طویل عرصے تک چشم پوشی اختیار کی جائے۔ میں نے ساحر کو لکھا تھا، مگر میری صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ کتنے انسان ہیں جن کے سینے دہکتی ہوئی گولیوں سے چھلنی کر دیئے گئے۔ کتنوں کے



لہو کے چھینٹوں سے منظر وار کو رنگین بنایا گیا۔ کتنی ماؤں نے اپنی ساری زندگی کی کمائی لٹا دی۔ کتنی سہاگنوں نے اپنی نازک کلائیاں سونی کر لیں۔ مانگ کے سیندور پونچھ ڈالے۔ کتنے بھائی سے بھائی اور باپ سے بیٹے بچھڑ گئے۔ مگر انسانی ہمدردی کے دعوے دار لگا ہوں پر بھاری پردے ڈال کر سو رہے ہیں۔ انسانی اور اخلاقی قدریں کھلے عام پامال ہو رہی ہیں۔ ایسے میں کہاں



کیپٹن اوصاف کا خط اپنی اہلیہ کے نام

رُوحی! شادی کی تیسری سالگرہ مُبارک ہو

اچھا روحی اور سناؤ۔ کیا حال چال ہیں۔؟ کیا مصروفیات ہیں۔ ہم یہاں پر مزے سے ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ انشاللہ جلد ہی تم سے ملاقات ہو سکے گی۔ آج کل یہاں پر انڈیا اور بنگلہ دیش میں کچھ مذاکرات جاری ہیں۔ امید ہے اس دفعہ ہمارا کچھ فیصلہ ہو جائے گا۔ مگر پھر بھی ہم ہر قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ایک نہ ایک دن تو ان کو مجبور ہو کر ہمیں اپنے وطن بھیجنا ہی پڑے گا۔ تم قطعاً فکر نہ کرنا اور خوش رہنا۔ رات تمہیں یہیں تک لکھ پایا تھا۔ اس وقت صبح کے چھ بجے ہیں۔ ۱۵ اپریل ہے۔ ابھی ابھی نماز سے فارغ ہوا ہوں۔ ارے ہاں! روحی۔ ہماری شادی کی تیسری سالگرہ بھی آ رہی ہے۔ میرا یہ خط شائد اس کے لگ بھگ تم تک پہنچے۔ لہٰذا میری طرف سے اس خوشی کے موقع پر پیار بھری لاکھوں نیک خواہشات قبول کرو۔ یہ حسین ساعت تمہیں مبارک ہو۔ خدا کرے کہ اگلے سال ہم یکجا ہو کر اس دن کو دھوم دھام سے منا سکیں۔ آمین۔ آؤ اس موقع پر ہم دونوں ایکبار پھر عہد کریں کہ ایک دوسرے کو اس سے بھی زیادہ بڑھ کر چاہیں گے۔ دکھ اور سکھ کے شریک ہوں گے۔ اور ہماری چاہت دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر کے ایک دوسرے کی پرستش میں تبدیل ہو جائے گی۔ کیوں ٹھیک ہے نا روحی! کیا خیال ہے تمہارا۔؟

ی تھا ۔
شنا ہی تقدیسِ مشرق کہاں ہیں!
و محترم بزرگ کاش یہ سمجھ سکیں ۔
ب بھی جو تمہارا ہے وہ تم پہچانو
پیغامِ محبت ہے جہاں تک پہنچے
ب و شاعر تو ہمیشہ آگ کے شعلوں کو آنسوؤں
ہے۔ خواہ آگ ویت نام میں بھڑک رہی ہو۔ یا
مشرقِ وسطیٰ میں ہو۔ یا برصغیر میں... مگر شائد
احساس تک نہیں کہ ۔
انسانوں کے دن بدلے تو ان پہ کیا گزری۔

میں فی الحال اپنے متعلق کچھ لکھنے سے احتراز کر رہا ہوں۔
میں ذاتی زخموں کی نمائش کا قائل نہیں۔

محترم بزرگ:۔ دعا کرتے رہا کیجیے، کہ خدا ہمیں باعزت اور باوقار طور پر وطنِ عزیز لے آتے۔ آمین — میں نے جذبات کی رو میں بہہ کر کیا لکھا۔؟ یہ تو خود بھی مجھے معلوم نہیں۔ لیکن آپ میرے ان چند سطورِ منتشر کا جواب ضرور لکھیے تاکہ مجھے علم ہو۔ کہ میرے جذبات آپ تک پہنچے۔

والسلام —— عقیدت و احترام کے ساتھ
لطیف پریشان نمبر ۵۳۵/۹۱ - ۹۱ پی۔ ڈبلیو کیمپ۔ بھارت



اے دیس کی ہواؤ

کیپٹن اوصاف

۱

اے دیس کی ہواؤ
واپس وطن کو جاؤ
اور سب کو یہ بتاؤ

ان کا پیام پاکر!
مسرور ہو رہے ہیں
ان کی محبتوں پر
قربان ہو رہے ہیں

ملک و وطن کی خاطر
ہر ظلم ہم اٹھالیں
اک قید تو ہے کیا شے؟
ہم زندگی لٹادیں

قائد جو مل گیا ہے
با ہمّت و قیشر
ہو اور عمر اس کی
بھٹکے گا نہ سفینہ

ئے قائد عوام بھٹو

۲

ملنے کو ہم سبھی سے
گھڑیاں یہ گن رہے ہیں
اک روز صبح ہو گی
شامیں یہ گن رہے ہیں

کہنا کہ بن تمہارے
ہیں خوب غم کے مارے
ہم جلد ہی ملیں گے
اللہ کے سہارے

کب تک یہ ظلم ہم پہ
کرتے رہیں گے ظالم
اک روز فتح ہو گی!
مٹ کر رہیں گے ظالم

ہم اس کے نام لیوا
جس کی ہے یہ خدائی
کچھ بھی فکر نہ کرنا
دو دن کی ہے یہ تنہائی

۳

ان کی محبتوں نے
دل کو بڑھا دیا ہے
سہہ لیں گے ہزار قیدیں
وہ حوصلہ دیا ہے

یہ دن گذر گئے ہیں
چند روز رہ گئے ہیں
پیارے وطن کے لوگو
ہم جلد آرہے ہیں

پھر عظمتِ وطن کو
اونچا کرینگے اک دن
اپنا مقام پھر سے
حاصل کریں گے اک دن

اک ہدیہ محبت
اوصاف کا ترانہ
سمجھی ہے سب حقیقت
کچھ بھی نہیں فسانہ

پیامی کے نام خط

ہمیں فخر ہے کہ ہم وطن کی خاطر قید ہیں

بھائی جان پیامی اور باجی!

جو ہو سکے نہ کبھی روشناس باب اثر
تمہیں وہ میری دعائیں سلام کہتی ہیں

سلام محبت!! "انتخاب" بالکل عبادت سمجھ کر سنتا ہوں... میری دعا ہے "انتخاب" ہمیشہ انتخاب ہی رہے میں تہہ دل سے آپ کے عملے کا مشکور ہوں کہ آپ لوگ خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے قیدیوں کے خطوط کے نہ صرف جوابات دیتے ہیں بلکہ ان کی فرمائش بھی کرتے ہیں۔

(ا) پیامی صاحب! ہم اخلاقی مجرم نہیں بلکہ ہمیں فخر ہے کہ ہم وطن کی خاطر قید ہیں۔ بلاشبہ ہماری قوم آزاد ہے لیکن یہ آزادی ہمارے اسلاف کی قربانیوں کی ایک مقدس امانت ہے، اور ہم نے یہ امانت اگلی نسلوں تک پہنچانا ہے۔ ہم نے اپنے آپ کو کس قدر اس کا اہل بنایا۔؟ ہم نے شہداء کے لہو کی کیا قیمت ادا کی؟ فرداً فرداً ہم نے اس کا جواب دینا ہوگا۔ کیا خیال ہے؟

(ب) پیامی صاحب! اس وقت تو عالمی ضمیر بیدار ہو چکا تھا، جب بقول ان کے بنگال جہنم زار بن چکا تھا۔ اب جبکہ ہزاروں قیدی عالم بے بسی میں طویل عرصے سے کیمپوں میں پڑے دہائی دے رہے ہیں، اور بنگال کی سنہری سرزمین لاکھوں انسانوں کے خون سے رنگین ہو رہی ہے، تو انسانی ہمدردی کے دعویداروں کو چپ کیوں لگ گئی ہے۔؟ ۱۹۴۵ء میں ساحر لدھیانوی جنگ کے مہیب شعلوں میں اپنے ملک کے جوانوں کو جھلسنا نہیں چاہتا تھا۔ تو وہ پکار اٹھا۔

یہ جنگ اور میرے وطن کے شوخ جواں
خریدی جاتی ہیں اٹھتی جوانیاں جن کی

۱۹۴۷ء میں کرشن چندر کے انسانیت پرست قلم نے انسانیت کی تباہی پر نعرہ لگایا۔ "ہم وحشی ہیں،" لیکن آج ان کی نظریں ان قیدیوں کی طرف کیوں نہیں اٹھتیں۔ انسانی ہمدردی کے یہ دعویدار کہاں سو گئے۔؟ راجندر سنگھ بیدی کے افسانے کیوں سے ہے ہیں۔۔؟ شاید انسانی ہمدردی کے دعویداروں اور عالمی ضمیر کو جگانے میں بڑی دیر لگے۔ کیونکہ یہ سب پیروں میں رچی ہوئی مہندی کو سسکیاں بھرتے محسوس نہیں کر سکتے۔ یہ انگلیوں میں پڑے چاندی کے چھلوں کی فریاد نہیں سن سکتے — لیکن ہم مسلمان ہیں، اور مسلمان کے ساتھ خدا کا وعدہ ہے، کہ لا تقنطو من رحمتہ اللہ ط۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ موت دس بیس آدمیوں کو ہی آ سکتی ہے ساری انسانیت مر نہیں سکتی۔ اور پیامی بھائی — سورج کو قید کر کے اندھیرا نہیں کیا جا سکتا۔ آفتاب کی کرنوں کو جکڑنا ناممکن ہے۔

اجنبی ہاتھوں کے بے نام گرانبارِ ستم
آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

(ج) پیامی بھائی —!! قیدیوں کی فرمائش میں خدارا ایسے نغمات نہ سنایئے گا جس کا تعلق محبت اور صرف محبت سے ہو، کیونکہ ؎

ابھی نہ چھیڑ محبت کے گیت اے مضطرب
ابھی حیات کا ماحول خوشگوار نہیں!

پیامی بھائی —!! میں ہجر و وصال کے رنگین احساسات سے منکر نہیں مگر ؎

مجھے نفرت نہیں ہے عشقیہ اشعار سے لیکن
ابھی ان کو غلام آباد میں، میں گا نہیں سکتا!
مجھے نفرت نہیں ہے حسنِ جنت زار سے لیکن
ابھی دوزخ میں اس جنت سے دل بہلا نہیں سکتا
ابھی وطن کو آتشیں نغمے سنانے دو
ابھی چنگاریوں سے گل رنگیں بنانے دو!

دعا کرتے رہا کیجئے۔ خدا تعالیٰ ہمیں باوقار اور باعزت طور پر وطن عزیز لے آئے۔ آمین۔

فکر نہ کیجئے پیامی بھائی، کیونکہ ؎

ہر مصیبت کا دیا ایک تبسم سے جواب
اس طرح گردشِ دوراں کو رلایا میں نے!

میری ایک نغمے کی فرمائش بھی تو ہے۔ نسیم بیگم مرحوم کی آواز میں فلم مادرِ وطن کا یہ نغمہ۔

اے وطن کے شہیدو، تمہیں وطن کی فضائیں سلام کہتی ہیں۔

والسلام ———

لطیف پریشان — ۱۲ مارچ ۷۳ء
جنگی قیدی نمبر ۹۱/۵۳۵ - کیمپ نمبر ۹۱

ڈاکٹر محمد نقی بھارت کے جنگی کیمپ میں علاج کی سہولت نہ ملنے کے سبب شہید ہوگئے

یہ خط انہوں نے اپنی شہادت سے دو روز قبل اپنی اہلیہ کو لکھا تھا (ادارہ)

ایک ڈاکٹر کا جرم کیا ہے؟

ڈاکٹر نقی شہید کا آخری خط

بھارتی جنگی کیمپوں میں پاکستانی نظربندوں، عورتوں اور بچوں پر جو مظالم ڈھائے جا رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ظالم دشمن اپنی بربریت اور دہشت انگیزی کے جذبوں کی تسکین چاہتا ہے۔ عورتیں اور بچے ان کیمپوں میں بدترین حالت میں ہیں۔ ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں۔

ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے مجھے ہسپتال میں علاج کے لئے داخل کیا گیا۔ لیکن جس طریقے سے میرا علاج ہو رہا ہے، میرا ذہن اسے قبول کرنے کو تیار نہیں۔ میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ بھارت جیسے بے رحم اور جلاد دشمن سے اسکے علاوہ اور کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ بے رحم دشمن یہ نہیں سوچتا کہ ایک ڈاکٹر کا آخر کیا جرم ہے۔ اس نے جنگ نہیں لڑی۔ نہ ہی ہتھیار ڈالے ہیں، وہ تو پوری انسانی برادری کی خدمت کرتا ہے۔ پھر آخر اس کے ساتھ ایسا انسانیت سوز سلوک کیوں کیا جا رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت بے بس انسانوں پر مظالم توڑ رہا ہے۔ اور خدا ہی جانتا ہے کہ بے بس اور پر کٹی بلبلیں قفس میں قید کے دن کیسے گزار رہی ہیں۔

آپ کی آواز

اِبنِ مریم کا اثر رکھتی ہے

از کپتان خلیل الرحمٰن طور۔
جنگی قیدی نمبر ۵۸۸/۳۳۰۰۰
کیمپ نمبر ۱۴۳۱-۳۳-اے۔پی۔او۔ ۵۶
بھارت۔

یادش بخیر قاصد اُن سے یہ جا کے کہنا۔۔
عزیز پیامی بھیا!
السلام علیکم۔ جب گھر سے خط نہ آنے پر مایوس ہو کر میں گنگنا رہا تھا کہ ؎

میں گوش بر آواز ہوں کوئی پکارے تو مجھے۔

اسی وقت آپ کی آواز کان میں پڑی۔ اس میں اتنی اپنایت، اتنا خلوص، اتنی محبت تھی کہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ آپ میرے ہی خط کا جواب میرے سامنے بیٹھے دے رہے ہیں۔ یاس و حرماں اور اپنا احساسِ محرومی دُم دبا کر میرے قریب سے بھاگ گئے۔ اور ایسا محسوس ہوا کہ میں دیارِ وطن میں اپنے عزیزوں میں گھرا بیٹھا ہوں۔!

اس کیفیتِ یاس میں یہ احساسِ لطیف کتنا کرشمہ کار ثابت ہوا، میں کیا عرض کروں۔ بس اتنا ہی کہنا کافی ہو گا کہ میں اَبدی طور پر آپ کا مشکور ہو گیا۔

اس دورِ نو میدی میں آپ اپنے دلفریب طرز اور خلوص اندازِ بیاں سے کتنا بڑا کارِ خیر کر رہے ہیں شاید آپ کو اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں۔ آپ کی آواز ہم بد نصیبوں کے لئے ابنِ مریم کا سا اثر رکھتی ہے، اور بہت سے دوری کے زخموں سے مجروح لوگوں کے دلوں پر مسیحائی کرتی ہے۔ بس۔ ہماری تو اللہ میاں سے یہی دعا ہے کہ آپ کے بیانِ جادو اثر کو اور بھی تیز تر کرے۔ آمین!

بھیّا۔ کیا ہمیں اختر شیرازی مرحوم کی وہ مشہور نظم سنائی جا سکتی ہے:
او دیس سے آنے والے بتا۔ کس حال میں ہیں یارانِ وطن!
مشکور ہوں گا۔ سب اہلِ وطن کو ہمارا اسلام پہنچا دیجئے ——— والسلام
آپ کا بھائی ——— خلیل الرحمٰن طور
گھر کا پتہ:۔ طور منزل لاہور۔

ہند کی قید میں پاکستانی
صحافیوں کے بارے میں

اس کی رہائی
اخبار نویسوں کے لئے ایک
بہت بڑی خبر ہوگی



آئی اے خاں کا جرم۔ مغربی پاکستان کا صحافی ہونا

● محمود شام ●

آئی۔ اے۔ خان۔ لندن سے چار مہینے کا صحافتی کورس کرکے لوٹے ہی تھے کہ انہیں مشرقی پاکستان میں رپورٹنگ کے لئے جانے کو کہا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ پی آئی اے کی آخری پرواز تھی، جس سے آئی اے خان ڈھاکہ کے لئے روانہ ہوئے، اور جو پرواز ڈھاکے پہنچ بھی گئی۔ وہ اپنے صحافتی فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہو گئے۔ انہیں جاتے وقت کیا علم تھا کہ ان پر وہاں کیا گزرے گی، اور وہ اس ASSIGNMENT سے کب واپس آئیں گے۔ الطاف یاور بھی ان کے ساتھ تھے۔ الطاف یاور اس سے پہلے بھی اس ملٹری آپریشن کے دوران دو بار رپورٹنگ کے لئے آچکے تھے۔ ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء سے باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ پروازیں ختم ہو گئیں۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان رابطہ صرف ٹیلیفون لائن تھی۔ جنگ شدید ہو گئی۔ آئی اے خان کی رپورٹیں آتی رہیں۔ جس سے ان کی خیریت کا علم ہو جاتا تھا۔ بعد میں ہماری تاریخ کا وہ المناک باب شروع ہوا، جس سے ہماری گردنیں اب بھی جھک جاتی ہیں۔ ہمارا سب کچھ لٹ گیا۔ عزت، آبرو، غیرت، وقار، سب کچھ چلا گیا۔

اور اب ہندوستان نے اپنے تمام وعدوں کے باوجود۔ دنیا کے ہر اصول اور اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر جن ترانوے ہزار انسانوں کو اپنا قیدی بنا رکھا ہے، ان میں ایک آئی اے خان بھی ہیں۔ آئی اے خان کا قصور یہ ہے کہ وہ اپنے وطن کی سرزمین پر رونما ہونے والے واقعات کی رپورٹنگ کر رہا تھا۔ وہ جنگ میں خود کوئی حصہ نہیں لے رہا تھا۔ لیکن بھارت کی حملہ آور فوج کے نزدیک تو وہ قابلِ گرفت تھا کیونکہ وہ مغربی پاکستانی تھا۔ دنیا بھر میں صحافیوں کو رعایت دی جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے صحافتی فرائض کے سلسلے میں ایسے مقامات پر جاتے ہیں تاکہ دنیا بھر کو حالات و واقعات سے باخبر رکھ سکیں۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آئی۔ اے خان۔ اپنے دوست، اپنے صحافی ساتھی کے لئے کچھ نہیں کر سکا۔ میں تو اس کے خط کا جواب بھی نہیں لکھ سکا، جو اس نے مجھے از خود لکھا تھا۔ شملہ کی سربراہ کانفرنس سے واپس آکر میں نے جنگ میں مضامین لکھے، تو آئی۔ اے خان کی والدہ محترمہ نے مجھے خط لکھا، جس میں یہ جاننا چاہا تھا کہ کیا شملے میں صحافیوں کے سلسلے میں بھی بات ہوئی۔ میں نے انہیں حالات سے آگاہ کیا اور اپنی طرف سے تسلی دی۔ انہوں نے آئی۔ اے خان کے نام خط میں میرے خط کا ذکر کیا۔ آئی اے خان نے مجھے خط لکھا اور شکریہ ادا کیا کہ میں نے اپنے خط کے ذریعے ان کی والدہ کو تسلی دی۔ اور گزشتہ دنوں کو یاد کرتے ہوئے پوچھا کہ رپورٹنگ کا کیا حال ہے۔ اور خاص طور پر پوچھا کہ حکام دوستوں کا کیا حال ہے؟

آئی۔ اے خان سے میرا خاص طور پر ساتھ پیپلز پارٹی کی رپورٹنگ میں رہا۔ وہ اے پی پی کی طرف سے پیپلز پارٹی کی پریس کانفرنسیں تقریبات کور کرتے تھے میں مساوات کا نمائندہ تھا۔ بھٹو صاحب کی پریس کانفرنس ہوئی۔ —— بھٹو صاحب کہیں سے آ یا جا رہے ہوتے تو ایئر پورٹ اکٹھے ساتھ جاتے اور آتے۔ اپنے پیشے سے انہیں انتہائی خلوص ہے۔ ایسے رپورٹر نہیں ہیں جو صرف نوکری کے لئے کام کرتے ہیں۔ وہ خبروں کو FOLLOW کرتے ہیں۔ ہر وقت مستعد رہتے ہیں۔ کیا ہو رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے؟ کون آ رہا ہے، کون جا رہا ہے۔ انتخابی مہم کے بعد ایک طویل عرصہ رات دن جلسے، جلوس، پریس کانفرنسیں، ڈھاکہ جانے والے، ڈھاکہ سے آنے والے۔ صبح کی پرواز، رات کی پرواز۔ میرے پاس ان دنوں گاڑی تھی۔ الیکشن کے بعد وہ اکثر خراب رہنے لگی تھی۔ آئی اے خان اپنا سکوٹر چھوڑ کر گاڑی میں ساتھ ہو لیتے۔ گاڑی راستے میں خراب ہو جاتی، تو آئی اے خان کی بے تابی دیدنی ہوتی۔ اسے یہ پریشانی ہوتی کہ خبر مس نہ ہو جائے۔ ذوالفقار علی بھٹو اور ممتاز علی بھٹو کو جب بھی کوئی بیان دینا ہوتا تو وہ مجھے مساوات سے بلا لیتے۔ اور اے پی پی سے آئی اے خان کو بلاتے۔ اکثر جلسوں، پریس کانفرنسوں میں گزشتہ پریس کانفرنس کا حوالہ دیتے ہوئے بھٹو صاحب کہا کرتے تھے۔ پوچھو اے پی پی کے آئی اے خان سے۔ میں نے کیا کہا تھا۔ یہی حکام دوست ہیں جن کا ذکر جنگی قیدی آئی اے خان نے کیا ہے۔ گورنر ممتاز علی بھٹو نے بھی دسمبر ۱۹۷۱ء میں حلف اٹھانے کے بعد مجھے اکیلا دیکھ کر پوچھا تھا، آئی اے خان کدھر ہے۔؟

اب پیپلز پارٹی کے حکام بیس ماہ کی حکومت کے بعد ممکن ہے آئی اے خان کو بھول گئے ہیں، کیونکہ اب تو پوری اے پی پی ان کی اپنی ہے۔ نیشنل پریس ٹرسٹ ہے۔ ریڈیو پاکستان ہے۔ ٹیلی ویژن ہے۔ اس وقت اے پی پی میں رہتے ہوئے بھٹو صاحب کی خبریں جاری کرنا کتنا مشکل تھا، یہ آئی اے خان کو ہی معلوم ہوگا۔ اس کے دوستوں کی حکومت میں جتنا عرصہ ہوا ہے، اتنا ہی عرصہ بلکہ چار پانچ دن زیادہ اسے بھارت کی قید میں ہو گئے ہیں۔ میں یہی سوچتا ہوں کہ اس قید میں آئی اے خان کو سب سے زیادہ پریشانی یہی ہوتی ہے کہ وہ کام نہیں کر رہا ہے۔ ایئر پورٹ آنٹرویو۔ کوئی آ رہا ہوگا۔ خبر مس نہ ہو جائے۔ دوسری ایجنسی والے یہ انٹرویو نہ کر جائیں۔ ہر وقت خبر کی جستجو

میں رہنے والا آئی اے خان کیمپ نمبر ۲۸ میں بیکار دن کیسے گزار رہا ہوگا۔ ۲۰ ماہ کا طویل عرصہ کوئی غیر کریڈٹ کئے بغیر آئی اے خان کا کیا حال ہوا ہوگا۔

میں نے بھارت میں قیام کے دوران ان صحافیوں کی رہائی کے لئے بات کی تو بھارت کی ایکسٹرنل پبلسٹی کے ڈائریکٹر مسٹر الیس کے سنگھ دودی کو دمی لاتے۔ انہوں نے بتایا کہ بھارت کے کوئی دو صحافی مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کے دوران سرحد عبور کر کے گئے تھے، ان کا کچھ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کہاں گئے۔ پاکستان حکومت ان کے بارے میں کچھ بتائے تو ہم ان صحافیوں کی رہائی کے لئے بات کر سکتے ہیں، کیونکہ ہمیں آخر اپنے صحافیوں کو بھی جواب تو دینا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے سفارت خانے کے جو افراد کراچی میں جنگ کے دوران پھنسے ہوئے تھے، انہوں نے خود پاکستان ٹیلی ویژن پر انہیں دیکھا تھا۔

میں نے ان سے کہا کہ ایک تو ان صحافیوں نے غیر قانونی طور پر پاکستان کی سرحد عبور کی تھی۔ ان کی کوئی رجسٹریشن نہیں ہوئی ہوگی۔ اس لئے کیا کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے پورا مشرقی پاکستان آپ کے پاس ہے۔ دفتر بھی، فائلیں بھی اور وہ حکام بھی۔ آپ خود تلاش کر لیں۔

میں نے بھارتی صحافیوں سے اس سلسلے میں بات کی۔ انہیں اس پر کوئی اعتراض نہ تھا اگر بھارت پاکستانی صحافیوں کو رہا کر دیا جائے۔ انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ نے بھی اس سلسلے میں کوششیں کیں۔ لیکن بھارت کی وہی ذہنیت ہے۔

آئی۔ اے خان تم جلد ہی رہا ہو کر ہم سے آملو گے۔ ہم انتظار کر رہے ہیں۔ کیونکہ اب تم خود ایک بہت بڑی خبر ہو گے۔

اداریہ

جنگی قیدی، بھارت، بنگلہ دیش اور بلوچستان

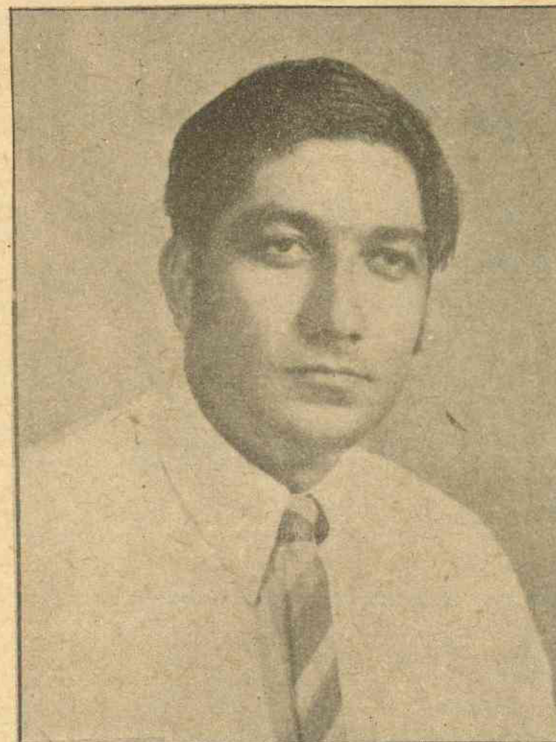
الفتح کے کارکنوں پر کافی عرصہ سے جنگی قیدی نمبر کی اشاعت کا قرض عائد تھا۔ مالی مشکلات، نیوز پرنٹ کی مکمل بندش اور سرکاری اشتہارات پر مکمل پابندی نے ایسے حالات کو جنم دے رکھا ہے کہ معمول کا شمارہ نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہو گیا ہے۔ انہی مجبوریوں کی وجہ سے اس بار الفتح کا سالنامہ شائع نہیں ہو سکا، تاہم جنگی قیدیوں کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ کچھ بھی ہو، ہر حالت میں یہ قرض چکانا ہے۔

اس اشاعت کا مقصد ان ترانوے ہزار پاکستانی جنگی قیدیوں کے عزیز و اقارب اور اہل خاندان سے اظہار ہمدردی کرنا ہے جنہیں بھارت اور بنگلہ دیش کے حکمرانوں نے بین الاقوامی ضابطوں، قوانین اور اصولوں کو پامال کر کے ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے جہاں معصوم بچے اپنے ابو کے انتظار میں صبح دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھ جاتے ہیں اور سارے دن ہٹ ہٹ نظریں گاڑے ویران راستوں کو تکتے رہتے ہیں، جب آنکھیں پتھرا جاتی ہیں، سورج غروب ہونے لگتا ہے تو وہ اپنے ابو کی جدائی میں بلکنے لگتے ہیں جو آج بھی نہیں آئے۔

اس موڑ پر ایسی بیوائیں بھی آنسو بہا رہی ہیں جن کے شوہر تو زندہ ہیں مگر وہ بیوہ بن گئی ہیں ان کے دلوں پر کیا گزرتی ہو گی، ان پر غم کا کونسا پہاڑ نہ ٹوٹا ہو گا، ان کے منتظر چہرے اپنے دامن میں بہت سی المناک، کہانیوں کی عکاسی کر رہے ہیں۔

یہ ایک ایسا انسانی مسئلہ ہے کہ دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی، بھارت اور بنگلہ دیش نے سنگدلی اور بین الاقوامی آداب کی پامالی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ جنگوں کی تاریخ شاہد ہے کہ آج تک کسی بھی ملک نے اتنے طویل عرصے تک دشمن ملک کے جنگی قیدیوں کو نظر بند نہیں رکھا یہی نہیں بلکہ جنگی قیدیوں پر ایسے مظالم روا رکھے گئے ہیں کہ آج کا مہذب انسان تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کوئی ملک اپنی طاقت کے بل بوتے پر اتنی ڈھٹائی اور بے شرمی کا مظاہرہ کرے گا۔

اس ضمن میں بین الاقوامی، بڑی طاقتوں کے کردار کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا روس اور امریکہ تماشائی بنے ہوئے ہیں روس کی خاموشی کا تو یہ جواز ہو سکتا ہے کہ وہ ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگ میں ایک اہم فریق تھا اور آج بھی وہ بھارت کا اتحادی ہے۔ امریکہ کے بارے میں یہ بات واضح



داؤد سبحانی

دشمن نے اس کا قلم اور کیمرہ چھین لیا لیکن فرض شناس صحافی کا دل نہیں چھین سکا

تحریر
ارشاد احمد خان

داؤد سبحانی کو خطرات سے کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ وہ اپنی صحافتی زندگی کے آغاز ہی سے ایسے مواقع کے منتظر رہتے جو پر خطر ہو سکتے ہیں۔ کراچی میں قیام کے دوران انہیں بھی گولی چلنے کی اطلاع مل جاتی وہ چشم زدن میں موقع پر پہنچ جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی رپورٹیں زیادہ جاندار ہوتی تھیں۔

داؤد سبحانی نے اپنی اخباری زندگی کا آغاز رپورٹنگ سے کیا تھا۔ لیکن چند برس کے تجربات کے بعد ہی وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کیمرے کے بغیر کامیاب رپورٹنگ نہیں ہو سکتی چنانچہ انہوں نے ایک چھوٹا سا کیمرہ بھی خرید لیا۔ اور رپورٹنگ کے ساتھ ساتھ واقعاتی تصویریں بھی اتارنے لگے۔ ان کی یہی خوبی اخبارات کے لئے زیادہ چارم کا باعث بنی، اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا جانے لگا۔ پھر قدرت نے بھی انہیں بعض مواقع فراہم کئے۔ مثال کے طور پر فلسطینی حریت پسندوں نے جب پہلا جہاز اتارا تو وہ لبنان کے دورے پر گئے ہوئے تھے۔ جہاز اترنے کی اطلاع ملتے ہی بے دھڑک صحرا میں پہنچے اور حریت پسندوں سے دوستی گانٹھ لی۔ یہ ان کی اپنے پیشے سے لگن اور فرض شناسی ہی کا جذبہ تھا کہ اس واقعہ کی سب سے زیادہ نمایاں تصویریں داؤد سبحانی ہی نے حاصل کیں، جو پاکستانی اخبارات کی زینت بنیں۔

مشرقی پاکستان میں جب ہنگاموں کی ابتداء ہوئی تو غالباً داؤد سبحانی پہلے صحافی تھے جو ڈھاکہ پہنچے۔ اور ان کی طبیعت کی جولانی کا مزید اندازہ اس وقت ہوا جب بھارت کے جارحانہ حملوں کے دوران وہ پاک افواج کے جیالے جوانوں کے دوش بدوش محاذ پر موجود تھے۔ خصوصاً دیناج پور کے محاذ سے جو رپورٹ اور تصویریں انہوں نے بھیجی تھیں وہ کم از کم مشرقی ممالک سے تعلق رکھنے والے رپورٹر اور فوٹوگرافر کے لئے ممکن نہیں تھیں۔

داؤد سبحانی کے اسی ذوق اور فرض شناس صحافت کے اسی جذبے نے انہیں دشمن کی قید میں پہنچایا۔ لیکن دشمن کی قید میں رہ کر بھی وہ اپنی ذمہ داریوں سے غافل نہیں۔ ان کے بارے میں جنگی قیدیوں کے کیمپوں سے جو اطلاعات ملی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار صحافی کا فرض وہاں بھی ادا کر رہے ہیں۔ دشمن نے ان سے قلم اور کیمرہ چھین لیا ہے لیکن وہ ان کے پہلو سے ایک ذمہ دار اور فرض شناس صحافی کا دل نہیں چھین سکا۔

وہ اسی صحافی کے دل سے آج دکھی قیدیوں کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں، انہیں تسلی دیتے ہیں اور صبر و تحمل کا دامن نہ چھوڑنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس فرض کی ادائیگی کی پاداش میں انہیں کوڑے بھی کھانا پڑے ہیں۔ بھارتی درندوں کی اذیت اور بربریت کا شکار بھی ہونا پڑا ہے۔ لیکن جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں بچے بچے کی زبان پر داؤد سبحانی کا نام ہے۔ کیونکہ وہ قیدی بچوں کا دل بہلانے کے لئے مزے مزے کے کھیل تماشے دکھاتے ہیں اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ ان کے ننھے منے ذہنوں سے قید کی اذیت کم ہو سکے۔

انہوں نے اپنے اس انسانیت دوست جذبے سے ثابت کر دیا ہے کہ صحافی خود دشمن کی کتنی ہی کڑی قید میں کیوں نہ ہو لیکن وہ اپنے فرض سے غافل نہیں رہتا۔ میں اپنے تمام صحافی بھائیوں کی طرف سے داؤد سبحانی کو سلام کرتا ہوں

بھارت نے داؤد سبحانی کو کوڑوں کی سزا دی

بھارت میں پاکستانی جنگی قیدیوں کے کیمپوں کی تفصیلات

پاکستانی جنگی قیدیوں کو بھارت کے مختلف شہروں کے ۵۲ کیمپوں میں نظر بند کیا گیا ہے ان میں سے بعض کیمپ بھارت کے دُور دراز علاقوں میں واقع ہیں۔ سب سے زیادہ جنگی قیدی دھنہ شہر میں رکھے گئے ہیں۔ یہاں جنگی قیدیوں کے سات کیمپ ہیں، الٰہ آباد، آگرہ، رام گڑھ اور رانچی میں چھ چھ کیمپ بنائے گئے ہیں۔ جنگی قیدیوں کے کیمپوں اور ان کے نمبروں کی تفصیلات مندرجہ ذیل ہے

شہر کا نام	کیمپ نمبر
الٰہ آباد	۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۹۹
آگرہ	۴۲، ۴۳، ۴۴، ۷۷، ۷۸، ۸۸
انبالہ	۹۰
بریلی	۲۹، ۵۶، ۵۷، ۵۸
دھنہ	۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵
فتح گڑھ	۴۵
فیض آباد	۴۶، ۴۷
گوالیار	۵۹، ۶۰، ۶۱
گیا	۹۳، ۹۶
جبل پور	۱۰۰
میرٹھ	۲۸، ۴۰، ۴۱، ۵۱
رام گڑھ	۲۵، ۲۶، ۲۷، ۹۱، ۹۴، ۹۷
رانچی	۳۰، ۳۱، ۳۲، ۹۲، ۹۵، ۹۸
روڑکی	۳۳، ۳۴
مہاراشٹر جیل	۶۶



بھارتی کیمپوں میں پاکستان کے 91498 قیدی نظر بند ہیں

بھارتی وزارت دفاع کے مطابق بھارتی کیمپوں میں پاکستان کے جو جنگی قیدی محبوس ہیں ان کی مجموعی تعداد اکانوے ہزار چار سو اٹھانوے ہے، ان میں سے چوّن ہزار سات سو ترپن بری فوج سے ایک ہزار چار سو انتیس بحری فوج سے اور آٹھ سو چھتیس فضائیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ سول ملازموں کی تعداد اٹھارہ ہزار ایک سو ستاسی اور عورتوں اور بچوں کی تعداد سولہ ہزار دو سو ترانوے ہے۔

جنگی قیدیوں کی بیگمات کے تاثرات

آج ہزاروں ساوتریاں آنسو بہا رہی ہیں

بھارتی حکمرانوں نے کیلاش کی چوٹیوں کا پیغام بھلادیا

بھارت کی لوک کہانیوں میں ایک کہانی بہت مقبول ہے۔ پتی ورتا ساوتری کی آزمائشوں کی دل گداز داستان۔ ہوا یہ کہ یم (موت کا دیوتا) نے اس کے شوہر ستیہ وان کی روح قبض کر لی اور پاتال (تحت الثریٰ) میں چلا گیا۔ جہاں جیتے جاگتے انسان کی رسائی ناممکن تھی۔ ساوتری کو جب اس کے شوہر کی موت کی اچانک خبر ملی تو چیخ اُٹھی۔ وہ شوہر کی جدائی کی آگ برداشت نہ کر سکی۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ اپنے شوہر کی آتما (روح) کو یم کے ظالم پنجے سے ضرور چھڑائے گی۔ اس نے شوہر کی لاش اٹھائی اور یم کا تعاقب شروع کیا۔ موت کے دیوتا تک پہنچنے کے لئے اس نے ناقابلِ بیان اذیتیں برداشت کیں۔ اس کی آہ وزاری سے جنگل کے خونخوار جانور، پکھیرو، یہاں تک کہ کیلاش کی برف پوش چوٹیوں پر بسیرا کرنے والے دیوتا بھی تڑپ اٹھے۔ لیکن پتھر دل یم نہ پسیجا۔ راستے میں یم کئی بار بہروپ بدل کر ظاہر ہوا۔ اس نے ساوتری کے راستے میں طرح طرح کی مشکلات کے پہاڑ کھڑے



مسز فوزیہ شاہ
اپنے بچوں کے ہمراہ



شوھر کی خوشنودی حاصل کرنا عورت کی معراج ھے

کئے آزمائشوں کی دہکتی ہوئی بھٹی روشن کی۔ دریا کا طلاطم پیدا کیا۔ ہلاکت خیز طوفان جگائے۔ اندھیری رات کا بھیانک سایہ پھیلایا۔ بھیروں اور بھتنوں نے دل ہلا دینے والی شکلوں میں نمودار ہو کر شوہر کی جدائی میں گریہ کرتی ہوئی اکیلی ساوتری کو ڈرایا دھمکایا۔ مگر ساوتری کے استقلال اور عظمت اور شوہر کو حاصل کرنے کی لگن کے سامنے دکھوں، مصیبتوں، اور مشکلات کے پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگئے۔ کیلاش کے دیوتا حیران اور دیویاں ساوتری کی بے کسی پر رو رہی تھیں۔ ساوتری نے سب کے دل جیت لئے تھے۔

یم نے کہا۔ "ساوتری مجھے بھی تمہارے آنسو دیکھے نہیں جاتے۔ تمہاری فریاد سنی نہیں جاتی۔ تمہارے دکھ درد پر میرا آسمانی دل بھی دھڑک رہا ہے۔ مگر میں کیا کروں، کیلاش کے دیوتاؤں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق میں تمہارے پتی کی زندگی واپس نہیں کر سکتا۔"

ساوتری نے رو کر جواب دیا۔ "دیوتا۔ تم نے انسانوں کے لئے قانون بنائے۔ تم ہی اس قانون کو توڑ سکتے ہو۔ مجھ سے پتی کی موت برداشت نہ ہوگی۔ میں ساری زندگی اس کی جدائی میں اتنے آنسو بہاؤں گی کہ کیلاش کی چوٹیاں ڈوب جائیں گی۔ تم میری زندگی لے لو، اور میرے شوہر کی آتما واپس کر دو۔"

یم، ساوتری کے استقلال اور اس کی محبت سے بیحد متاثر ہوا۔ اس نے کہا۔ "تمہیں شوہر کی آتما حاصل کرنے کے لئے پاتال کے آخری سرے تک جانا ہوگا، جہاں آج تک کسی انسان کا قدم نہیں پہنچا۔ اگر تم اس جگہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو تم اپنے شوہر کی زندگی دوبارہ حاصل کر لو گی۔ اس راستے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ البتہ اس جگہ پہنچ کر تم آسانی سے اپنے شوہر کی آتما حاصل کر سکو گی۔ دلوں پر لرزہ طاری کر دینے والے میرے پہریدار تم سے کچھ نہیں کہیں گے۔"

غرضیکہ پاتال کے آخری سرے تک پہنچنے کے لئے ساوتری کو ایک بار پھر ناقابلِ بیان آزمائشوں اور مشکلات کا سمندر پار کرنا پڑا۔ اس نے ہمت نہ ہاری۔ وہ برابر آگے بڑھتی رہی۔ بھوک پیاس اور شوہر کی جدائی نے اس کو نڈھال کر دیا تھا۔ مگر وہ برابر چلتی رہی۔ اور بالآخر پاتال کے آخری سرے تک پہنچ کر اپنے شوہر کی آتما حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ مردہ سیتہ وان کو دوبارہ زندگی ملی تو جنگل کے وحشی درندے، پرندے اور جانور خوشی سے ناچ اٹھے۔ چشموں سے نغمے پھوٹ نکلے، درختوں کے پتے تالیاں بجانے لگے، اور کیلاش کی برف پوش چوٹیوں سے ایک ایسا ناقابلِ فراموش میٹھا اور ولولہ انگیز نغمہ منتشر ہونے لگا، جس میں ساوتری اور انسان کی عظمت کو سلام پیش کیا گیا تھا۔

یہ اس ملک کی لوک کہانی ہے جس نے اپنے پڑوسی ملک پاکستان کے ترانوے ہزار فوجیوں اور شہریوں کو تمام اخلاقی و سیاسی اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے نظر بند کر رکھا ہے۔ ان جنگی قیدیوں کی بیویاں، بچیاں، بچے، عزیز اور رشتہ دار ان کی جدائی کی آگ میں ساوتری کی طرح جل رہے ہیں، لیکن بھارت نے دونوں کے درمیان پاتال کی گہری اور دوری پیدا کر دی ہے۔ اور دونوں کو ایک دوسرے

خواتین، جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے مثبت انداز میں جدوجہد کر رہی ہیں

دیہات میں رہنے والی جنگی قیدیوں کی بیویاں سخت مصائب کا شکار ہیں

سے دور رکھنے کے لیے سنگدلیم کی طرح مشکلات اور مصائب پیدا کر رہا ہے۔ کیا مسز اندرا گاندھی تک شوہروں کی طویل جدائی سے بیاکل ان کی بیویوں کی اداس اور غمزدہ آوازیں نہیں پہنچ پا رہی ہیں۔؟ کیا انہوں نے کیلاش کی برف پوش چوٹیوں سے گونجنے والے اس پیغام کو فراموش کر دیا۔ جس میں کہا گیا تھا تھا کہ انسانوں کے درمیان جدائی اور فراق کی آگ جلانیوالے انسانیت کے بدترین دشمن ہیں۔ اگر مسز اندرا گاندھی ابھی تک ہزاروں لاکھوں ساوتریوں کے غم سے ناآشنا ہیں تو ہم ایک بار پھر ان کی جدائی کے دکھ بھرے لمحات ایک غیر ملکی صحافی برنارڈ وین راب کی زبانی سناتے ہیں۔

مسز نسیم کے ملنے جلنے والے اور اہلِ محلہ قطعی طور پر انہیں نظر انداز کر چکے ہیں۔

مسز فریدہ شاہ کے دوست احباب کبھی کبھار رسمی طور پر اس سے خیریت دریافت کرنے کا فریضہ زبردستی انجام دیتے ہیں، ان کے لہجے سے بیزاری اور اکتاہٹ کا صاف اظہار ہوتا ہے۔

"میں اب گھر کی چہار دیواری میں قید ہو کر گہرے افسردہ رنگوں کے کپڑے پہنتی ہوں۔ اور کبھی سیر و تفریح کے لئے باہر نہیں جاتی ہوں۔ خاص طور سے شام کے وقت میں ایسی بیوہ ہوں جس کا شوہر زندہ ہے۔" جوان خوبصورت افسردہ آنکھوں والی دو بچوں کی ماں مسز بدر نے بے حد غمناک لہجے میں انکشاف کیا

مسز بدر اور ان کی دوسری دونوں سہیلیوں کا شمار پاکستانی جنگی قیدیوں کی بیگمات میں ہوتا ہے ان کے شوہر بھی ان ترانوے ہزار پاکستانیوں میں شامل ہیں، جو ہندوستان کے پچاس کیمپوں میں بنگلہ دیش کے ظہور پذیر ہونے کے بعد ۱۹۷۱ء سے اب تک قید ہیں۔

کوئی شنوائی نہیں!

"ہماری سوسائٹی اور معاشرے کے بناتے ہوئے قوانین کے تحت کسی بھی عورت کے لئے یہ انتہائی دشوار امر ہے کہ وہ شوہر کے بغیر تنہا زندگی گزار دے۔ کیونکہ لوگ اس حقیقت کو کبھی قبول نہیں کر سکتے کہ ضروری کاموں کے لئے بھی خواتین گھر سے باہر نکلیں۔ چہ جائیکہ رائے عامہ کو ہموار کرنے کے لئے منظرِ عام پر آنا۔"

ایک پاکستانی آرمی انجینئر کی بیگم مسز شاہ جو کہ خود بھی کانونٹ کی تعلیم یافتہ ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے ملک میں خواتین کے مقام کا ذکر کرتے ہوئے کچھ اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "ہمارے ہاں عورت کا اصل مقام گمنامی ہے۔



جلوس میں شامل ایک بچی ہاتھ میں پلے کارڈ اٹھائے ہوئے ہے

یعنی عورت کو بالکل الگ تھلگ روپوش رہنا چاہیئے۔ لیکن جب ہم جنگی قیدیوں کے لئے مظاہرہ کرتے ہیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پر مظاہرہ کرتے ہیں تو اس کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی ہماری آواز کو فضول اور بے معنی سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔"

اگرچہ مغربی ممالک کے مقابلے میں یہاں آزادیٔ نسواں کا تصور تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے مگر پھر کبھی پاکستانی جنگی قیدیوں کی بیگمات نے انتہائی تذبذب کے عالم میں معاشرتی دباؤ اور بے حسی کے خلاف جو قدم اٹھائے ہیں اس سے یقیناً دوسری خواتین کو بھی نئی راہ ملے گی۔

سوسائٹی کے بنائے ہوئے قوانین کے غیر لچکدار ہونے کی بنا پر کسی بھی عورت کا تنہا رہنا ممکن نہیں۔

مسز شاہ راولپنڈی میں اپنے والد کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ لوگوں کی ذہنیت پر گفتگو کرتے ہوئے انہوں نے کہا "ہمارے ہاں کے لوگ بڑے تنگ نظر ہیں۔ انتہائی قریبی عزیز و دوستوں نے بھی یہ کہہ کر ملنا جلنا ترک کر دیا ہے کہ تمہارے شوہر تو یہاں موجود نہیں، تم سے کیا ملیں۔ عورت شوہر کے بغیر کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ یعنی محفلوں اور پارٹیوں میں لوگ ہمدردی اور خلوص سے ملنے کی بجائے طنز و تشنیع کا نشانہ بناتے ہیں۔"

کراچی لاہور اور راولپنڈی جیسے ماڈرن شہروں میں جنگی قیدیوں کی بیگمات کو زبردستی اس بات پر آمادہ کیا جا رہا ہے کہ وہ اس سکوت کو توڑ کر متوسط طبقے کی پاکستانی خواتین کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ خرید و فروخت کے لئے تنہا جائیں۔ عزیز و اقارب سے ملنے جلنے کے لئے کسی دوسرے کا سہارا نہ ڈھونڈیں۔ ڈاکٹر وکیل، انشورنس پالیسیوں وغیرہ سے متعلق تمام فیصلے بذاتِ خود کریں۔ اس کے علاوہ کار چلانا اور بچوں کے اسکول سے متعلق مسائل بھی خود نپٹائیں۔

برصغیر میں بنگالیوں اور بہاریوں کی منتقلی کا مسئلہ نزاعی صورت اختیار کر گیا ہے۔ یعنی ۱۵۰۰۰۰ تا ۱۷۵۰۰۰، بنگالی پاکستان سے بنگلہ دیش جانے کے لئے بے تاب ہیں۔ اور اسی طرح ۶ لاکھ، نو لاکھ بہاری یا غیر بنگالی بنگلہ دیش سے پاکستان منتقل ہونا چاہتے ہیں۔

"گھر میں بچوں کے درمیان شوہر کی خوشنودی حاصل کرنا ہی عورت کی معراج ہے۔"

مسز خان جو کہ لیفٹیننٹ کرنل کی بیگم ہونے کے علاوہ جنگی قیدیوں کی فلاح و بہبود کی انجمن نیشنل کونسل کے جنرل سیکرٹری بھی ہیں۔ انہوں نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا "دوسرے لوگوں نے تو ہماری خاصی حوصلہ شکنی کی ہے۔ لیکن ہم پھر بھی باہر نکل آئے ہیں۔ میرے شوہر مذہبی قسم کے انسان تھے۔ اچانک ہمیں پتہ چلا کہ مفتوح ہونے کے سبب قید کر لیا گیا تب مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی کل کائنات ہار بیٹھی ہوں۔"

مشکلات

سوسائٹی کے فرسودہ قوانین کے تحت گھر سے تنہا ایک قدم باہر نکالنا بھی مشکل ہے۔

مسز خان نے جو چار بچوں کی ماں ہونے کے علاوہ ایک باحوصلہ خاتون ہیں، معاشرے میں تنہا زندگی گزارنے والی خواتین کو آنے والی مشکلات کا ذکر کیا ——— "وہ اپنے چھوٹے سے اینٹوں سے بنے ہوئے گھر میں اپنا روایتی لباس یعنی شلوار اور کرتا پہنے ہوئے تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ "میرے پڑوسی میری طرف اکثر ناگواری سے دیکھتے ہوئے فوراً ہی اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتے ہیں۔ اگر لوگ ہمیں تنہا کار ڈرائیو کرتے ہوئے دیکھ لیں تو اس پر بھی کافی جز بز ہوتے ہوئے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں اس قسم کی گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔ گویا ان کی نظر میں کار ڈرائیو کرنا یا کسی ضرورت سے ہمارا باہر نکلنا سیر و تفریح میں شامل ہے، جسے وہ برداشت نہیں کر سکتے۔ محض اس لئے کہ ہمارے شوہر فی الحال ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ خیر میری تو اس لحاظ سے بڑی خوش قسمتی ہے کہ میں تعلیم یافتہ ہوں، اس لئے لوگوں کی غلط باتوں کا اثر قبول نہیں کر سکتی۔ مگر میں سوچتی ہوں کہ ہمارے ہاں دیہات اور قصبوں میں رہنے والی خواتین کا کیا حشر ہو رہا ہوگا۔ وہ تو ان خود ساختہ نظریات میں بری طرح پس رہی ہوں گی۔ کیونکہ ان کے پاس نہ دولتِ مال و زر ہے اور نہ ہی تعلیم، اور ان کا شوہر جنگی قیدی ہے۔ انہیں تو یقیناً غیر معمولی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہوگا ——— دیہات میں رہنے والی جنگی قیدیوں کی بیویوں کی گزر بسر صرف اس محدود رقم پر ہو رہی ہوگی جو انہیں ہر ماہ حکومت سے بطور شوہر کی تنخواہ یا پنشن ملا کرتی ہے۔ ان میں بیشتر ایسے جوان شامل ہوں گے جن کی ماہانہ آمدنی صرف پندرہ ڈالر سے زیادہ نہیں، اس کے ساتھ ہی ان پر والدین کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔"

گاؤں کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے مسز خان نے مزید بتایا کہ "گاؤں اور قصبوں میں دورے کے دوران ہم نے بعض ایسی عورتوں کو بھی دیکھا جو زار و قطار روتے ہوئے خداوند تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہی تھیں کہ جلد از جلد ان کے شوہر واپس آجائیں۔"

دیہات میں رہنے والی خواتین میں ساس بہو کے جھگڑے بالعموم روپے پیسے کی کمی کی بنا پر ہو رہے ہیں۔ بہو کسی قیمت پر بھی ساس کو ساتھ رکھنے پر آمادہ نہیں۔ کبھی پیسوں پر جھگڑا ہوتا ہے تو کبھی چولہے پر۔ اتنے سارے لوگ اتنی کم آمدنی میں گزارہ کریں بھی تو کیسے۔؟ یہ عورتیں سخت مصائب کا شکار

Pakistan's P.O.W. Wives — Suffering the Stigma Of Being Women Alone

"پاکستانی جنگی قیدیوں
کی بیویاں اذیت ناک
تنہائی کا شکار ہیں"
نیویارک ٹائمز

By BERNARD WEINRAUB
Special to The New York Times

place for a woman is to be hidden. When we dem- lic figures, leading demon- strations urging the release

میرے والد نے کہا کہ تمہیں اکیلے گھر سے باہر قدم نکالنے کی ضرورت نہیں

ہیں، اور کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں سے وہ سکون حاصل کرسکیں۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے مسز خان نے کہا "شوہر کے بغیر زندگی بے کار ہے۔ اس سے موت بدرجہا بہتر ہے۔"

شہروں میں رہنے والی خواتین کا یہ حال ہے تو کیا آپ تصور کرسکتے ہیں کہ گاؤں میں رہنے والی عورتوں کے ساتھ لوگ کس قسم کا سلوک روا رکھتے ہوں گے۔ اس قسم کے حالات سے دوچار ہونے کے سبب جانے کتنی ہی جنگی قیدیوں کی بیویاں نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوگئی ہیں، تو بعض کی افسردگی اور اضمحلال نے انہیں ڈاکٹروں کا مرہونِ منت کر دیا ہے۔

شہروں میں رہنے والی خواتین تک کو گھر والوں اور ملنے جلنے والوں کی مرضی کا پابند ہو کر زندگی گزارنا پڑ رہی ہے۔ اس ضمن میں مسز شاہ نے اپنا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ "میرا بچہ بیمار تھا اور اس کے لئے مجھے دوا لیکر آنا تھی، اس لئے میں خود ہی ڈاکٹر کے پاس چلی گئی۔ میرے والد جو کہ ایک ریٹائرڈ سفیر ہیں۔ انہیں جب میرے اس طرح باہر جانے کا علم ہوا تو انہوں نے مجھے بلا کر کہا۔ "اکیلے گھر سے باہر قدم نکالنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے انہیں بتایا کہ میں کوئی بچی نہیں ہوں بلکہ چار بچوں کی ماں ہوں۔ تب ان کا رویہ کچھ بدلا۔ اور انہیں یہ احساس ہوا کہ اب چونکہ میری زندگی بدل چکی ہے اس لئے ہر چیز میں تغیر و تبدیلی آنا ضروری ہے۔"

اسی طرح مسز خان نے اپنا تجربہ دہراتے ہوئے بتایا کہ "اٹلی کے رہنے والے ان کے دو شادی شدہ دوستوں نے انہیں بمعہ بچوں کے چھٹیوں میں راولپنڈی سے اپنے ہاں بلوانے کی کوشش کی، جسے سن کر میرے بھائی نے فوراً ہی انکار کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں! ہم یہ برداشت نہیں کرتے کہ تم غیر ملکیوں کے ساتھ کہیں جاؤ۔ ایک عورت کے لئے یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شوہر کی عدم موجودگی میں بچوں کو لیکر غیر ملکیوں کے ساتھ کہیں گھومے پھرے۔" ان کی اس دلیل کو سن کر میں نے جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔"

خواتین کو جنگی قیدیوں کے کیمپوں سے بھیجے جانے والے خطوط میں سے اوسطاً ایک خط ماہانہ ملتا ہے۔ اس لحاظ سے جنگی قیدیوں کی بیگمات کی یہ کوششیں پاکستانی سوسائٹی



ہمارے عزیز و اقارب جلوس اور مظاہرے کی مخالفت کرتے ہیں

میں مثبت صورت میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ یعنی یہ خواتین فی الحال تو جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے مثبت انداز سے جدوجہد کرتے ہوئے سوسائٹی میں اپنا کردار بخوبی نبھا رہی ہیں۔ مگر جب جنگی قیدی رہا ہو جائیں گے تب ان کا سوسائٹی میں کیا رول ہوگا۔ اس بارے میں وہ خود بھی تذبذب کا شکار ہیں۔

مسز خان کا کہنا ہے۔ "میں جانتی ہوں کہ جونہی میرے شوہر واپس آئیں گے۔ میں اپنے اسی اسٹیج پر پہنچ جاؤں گی یعنی پھر گھر ہی تک محدود ہو کر رہ جاؤں گی۔ مگر یہ تو مستقبل کی بات ہے۔ فی الحال تو ہم نوجوان خواتین کے لئے نئی راہ کھول رہے ہیں۔ ہم ٹیلی ویژن پر آئے۔ ہم نے عوام الناس کے سامنے اظہارِ خیال کیا اور مظاہرے کئے۔ اس سب کچھ سے ہماری آزادی ظاہر ہوتی ہے۔ اب ہماری بیٹیوں کے لئے حالات تبدیل ہو جائیں گے۔"

مسز شاہ شہر سے دو میل کے فاصلے پر اپنے کمرے میں بیٹھی کافی کی چسکیاں لینے کے ساتھ ساتھ اپنے پانچ سالہ بیٹے عامر کو گیند سے کھیلتے دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے کہا۔ "ہماری حالت ضرور بدلے گی۔ ہم کبھی اس حال میں نہیں رہینگے۔"

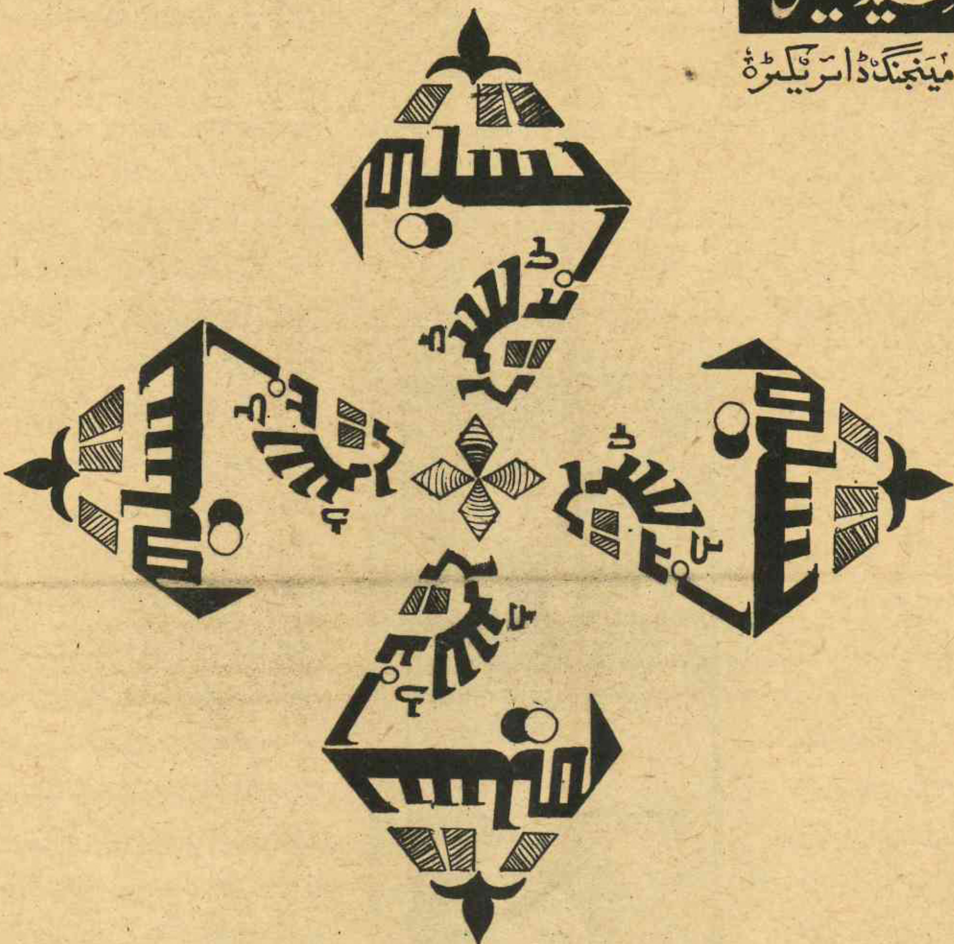
پھر انہوں نے آہستگی سے زیرِ لب کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ مجھ میں اپنی زندگی بدلنے کی ہمت نہیں۔ مگر میں یہ بھی جانتی ہوں کہ کسی نہ کسی حد تک تبدیلیاں ضرور رونما ہوں گی۔ نوعمر لڑکیاں ہم سے قطعی مختلف زندگی گزارنے کی متمنی ہیں۔ ہماری شادیاں ہمارے گھر والوں کی مرضی کے مطابق ہوتیں۔ مگر اب جبکہ آپ جانتے ہی ہیں لڑکیاں اپنا ساتھی خود تلاش کرنے کی متمنی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں کس قدر اختلاف ہے۔"

مسز شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میری تین لڑکیاں ہیں، اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ وہ مجھ سے قطعی مختلف ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں ان کی شادی اپنی مرضی سے کرنا پسند کروں گی۔ کیونکہ یہی دستور ہے جسے میں چھوڑ نہیں سکتی۔"

بشکریہ

خورشید سہیل

مینجنگ ڈائریکٹر



تسنیم انڈسٹریز ۳/۲ ٥ ناظم آباد ٥ انڈسٹریل ایریا ٥ کراچی

سنو! آواز آرہی ہے

اقبال میسر

سنو! موسیٰ خان شہید کی آواز سنو!
سنو! موسیٰ خان شہید کی ماں کی آواز سنو!
سنو! لانس نائیک موسیٰ خان شہید وطن کی عظمت پر قربان ہوگیا۔

موسیٰ خان شہید جس نے ۶ ستمبر کی صبح کو کمینہ رذیل اور درندہ صفت دشمن کی اچانک یلغار کا منہ توڑ دیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جلّو موڑ سے واہگہ کی سرحد کو جانے والی ریل کی پٹڑی اُڑا کر اس شبخون کو کند کر دیا تھا۔

موسیٰ خان شہید نے وطن کی ہر ماں کی کوکھ کی لاج رکھ لی جس نے اپنا "آج تمہارے "کل" پر قربان کر دیا۔

سنو! جلّو موڑ کا مینار جس پر شہیدانِ وفا اپنا ابدی پیغام تمہیں سنا گئے۔ "ہم اپنا آج تمہارے کل پر قربان کر گئے"

سنو! یہ آواز ہر اُس ماں کے جری بیٹے کی آواز ہے، جو مادرِ وطن کی کوکھ کی لاج پر پروانہ وار نثار ہو گئے۔ یہ ۱۷ دن کی خون آشام کہانی ہے۔ یہ مردانِ حُر کی وطن پر نثار ہونے کی لہو بھری کہانی ہے۔

سنو! یہ ان ماؤں کا ہدیہ ہے، جنہوں نے اپنے لالوں کو مسافرانِ فرات کی حریت کا درس دیا تھا۔ اور جن کی لگا ہوں میں بی آر بی مادرِ وطن کی لاج بن گئی تھی۔ جن کے سامنے بحرۂ قلزم۔ دریائے توی کے بحر کے روپ میں بہہ رہا تھا۔ جن کی ضرب نے ریگستانوں کے فاصلے سمٹا دیئے تھے۔

اس آواز کی بازگشت وہ درخت سنا رہا تھا، جس کی ٹہنیوں پر دسمبر ۱۹۶۵ء کی سرمئی دوپہر کے وقت ماں کی محبت گانوں اور سہروں کے روپ میں موجزن تھی اور جس درخت کے سائے میں موسیٰ خان شہید امر کہانی بن گیا تھا۔

موسےٰ خان شہید، جس نے مادرِ وطن کی آغوش میں ابدیت چاہی اور اس نے ابدیت پالی۔ موسیٰ خان شہید اپنی قبر میں اپنی ماں کے قدموں کی چاپ صاف سنتا رہا، اور خاموش تھا کہ ماں، ماں بن کر آئی ہے۔ کیونکہ اس کی ماں جاتے ہوئے اپنے دوسرے لال کو بھی مجاہد فورس میں چھوڑ گئی۔ اسے کہہ گئی کہ تم بھی موسیٰ خان بننا تاکہ کسی بہن کے سر سے چادر نہ اترنے پائے۔ کوئی بیٹی پھر ننگی نہ ہونے دینا۔ اللہ تیرا نام بھی رہتی دنیا تک رکھے۔

موسیٰ خان شہید کی یہ آرام گاہ۔ ایک روشنی کا مینار ہے، جرأتِ عظمت اور رفعت کا۔

سنو! زندہ قومیں تو شہیدوں کے جانبازوں کے، مردانِ حُر کے مینار، شہر بہ شہر، قریہ بہ قریہ بناتی ہیں۔ ہاں تم نے تو تحریکِ پاکستان کے شہید اوّل عبدالغفور کا مینار



شہیدوں کے لہو کا سودا کیا تو در و بام اور زمین کانپ گئی

بھی نہ بننے دیا۔ کیونکہ تم نے ہمیشہ حصار باندھے ہیں عصبیت کے، علاقائیت کے، طبقاتی امتیاز کے، اور ان پر آسائشوں کے مینار کھڑے کئے ہیں۔ تمہارے کھڑے کئے ہوئے یہ مینار اور ان کے گرد دیوار بندی ہمیشہ منہ کے بل ڈھی ہے۔ ڈھتی رہے گی۔ کیونکہ تم نے شہیدوں کے خون کا قرض نہیں چکایا۔

سنو! ہزاروں جانباز بیٹوں، نثارانِ وطن، مردانِ حُر اور شہیدانِ وفا۔ جن میں ہر ایک نے ایک دوسرے سے بڑھ کر قصور، کھیم کرن، بیدیاں، برکی، ڈوگرائی، ظفروال، چونڈہ، سیالکوٹ، چھب، جوڑیاں، کارگل اور منا باؤ کی تپتی ہوئی ریتوں کے معرکۂ وفا میں بلا خوف و خطر آتشِ نمرود کو اپنے لہو سے ٹھنڈا کیا تھا۔ تم نے جب ان کے لہو کا سودا دیارِ غیر میں کرنا چاہا تو دیارِ غیر کے در و دیوار اور زمین کانپ گئی۔ لرز لرز اٹھی۔ ایک بار نہیں، دوبار، سہ بار۔

اور بھیڑیا بھی بالآخر خوش مرگی کا شکار ہوگیا۔

سنو! وطن پر جب بھی وقت پڑا تو تم وطن کے ہر بیٹے کو موسیٰ خان، عزیز بھٹی، سرفراز رفیقی، رشید شامی یونس، ضیاءالدین عباسی، سرور، علاؤالدین ہی پاؤ گے، اُن کا ایک ہی روپ ہے۔ ایک روپ، صرف ایک روپ! یہ ایک دل ہیں۔ یہ ایک جاں، ان کا "آج"، ہمیشہ تمہارے "کل" پر قربان ہوتا رہے گا۔ جب تک کہ ان کے "آج" کی روشنی تمہارے "کل" کے اندھیروں پر غالب نہ آجائے۔ تمہاری مصلحتوں کے اوہام کے بُت، شرفِ انسانیت کے سامنے زمین بوس نہ ہو جائیں۔

سنو! آج کے دن اپنے کان کھلے رہنے دو، تاکہ تم اپنے کل کی فکر کر سکو۔

سنو! موسیٰ خان شہید کی ماں کی آواز سنو! کہ یہ ہر شہید اور ہر غازی کی ماں کی آواز ہے۔

سہرے والیو! تمہاری جوانیوں کی خیر
تمہاری سہاگنوں کے آنچلوں کی خیر
اور وطن کے دامانِ تار تار کی خیر۔

سنو! آواز آرہی ہے۔

وطن کا۔ ان جری ماؤں کو سلام جن کی کوکھ نے کمالپور میں عہدِ شبیری نبھانے والوں کو جنم دیا۔

ان عظیم بہنوں کو سلام۔ جن کے جیالے بھائی ان کے آنچلوں کی حرمت پر مر مٹے۔

ان معصوم بیٹیوں کو سلام، جن کے ہاتھوں کی حنا کی خاطر ان کے عظیم باپ کمال پور کی دھرتی کو لہو کر گئے۔

ان سہاگنوں کو سلام، جن شجاع سرتاج ان کے سہاگ امر کر گئے۔

ان بیٹوں کو سلام، جن کے دلیر باپ ان کے لئے نشانِ منزل بن گئے۔

ان شیر دل باپوں کو سلام۔ جن کے سائے میں کمال پور کے بہادروں نے مادرِ وطن کا علم بلند رکھا۔

اے جری ماؤں، اے عظیم بہنو، اے معصوم بیٹو، اے سہاگنو، اے بیٹیو، اے شیر دل باپو، پوری قوم آج تمہاری بہادری کے کارناموں پر یک دل یک جان ہو کر اپنا سلام کہتی ہے۔

تم نے ہمیشہ
عصبیّت علاقائیت
اور طبقاتی امتیاز
کے مینار کھڑے کئے ہیں

"سلام کمال پور کے جیالوں کو۔
سلام کمال پور کے غازیوں کو۔
سلام کمال پور کے شیروں کو۔
سلام کمال پور کے شاہ زوروں کو۔
سلام کمال پور کے ہمت کے ستاروں کو۔
سلام کمال پور کے مردانِ حُر کو۔
سلام کمال پور کے مجاہدوں کو۔
سلام کمال پور کے محافظوں کو۔
سلام کمال پور کے جانبازوں کو۔
سلام کمال پور کے عاشقانِ وفا کو۔

جنہوں نے مکار، کمینے، ذلیل دشمن کے تابڑ توڑ حملوں کا منہ توڑ دیا۔

جیالوں نے زیرِ شمشیر رقصِ وفا کیا۔
وہ رقص کہ جس سے عدو خاک میں مل گیا۔
وہ رقص کہ جس سے ٹکرانے والے پاش پاش ہو گئے۔
وہ رقص کہ جس سے کمال پور پر بڑھنے والا ہاتھ کاٹ دیا گیا۔
وہ رقص کہ جس سے کمال پور پر اٹھنے والی ہر آنکھ نکال دی گئی۔
وہ رقص کہ جس سے کمال پور پر بڑھنے والا ہر پاؤں جنبش سے پہلے شل کر دیا گیا۔
وہ رقص کہ جس سے بھیڑیئے اپنے ہی لہو میں ڈبو دیئے گئے۔

گواہ رہنا اے سرزمینِ پاک۔
گواہ رہنا۔ پدما کے پانیوں۔
گواہ رہنا۔ کمال پور کے سبزہ زارو۔
گواہ رہنا۔ کمال پور کے چاند تارو۔
گواہ رہنا۔ کمال پور کی ماؤں، بہنو، بیٹیو اور باپو۔

یہ وطن کی سالمیت کی جنگ۔
وطن کی عظمت کی جنگ۔
وطن کے دفاع کی جنگ میں اپنا آج ہمیشہ وطن کے کل پر قربان کرتے ہیں۔
یہ وطن کے ایک ایک انچ کی خاطر جان کی بازی لگا رہے ہیں۔
انہیں کوئی خوف نہیں کہ دشمن کتنے لاؤ لشکر کے ساتھ آیا ہے۔
انہیں کوئی فکر نہیں کہ ان کے گھر کتنی دور ہیں۔
ان کے لئے پورب بھی ایک ہے۔ پچھم بھی ایک ہے۔

وطن کی آبرو پر مر مٹنے والے کب تک اغیار کی قید میں تمہارا منہ دیکھیں گے ؟

یہ سرزمینِ وطن کا سوال ہے۔
وطن کے تقدس کا سوال ہے۔
وطن کی حرمت کا سوال ہے۔
یہ وطن کی فولادی زرہ ہیں۔
یہ آخری سانس تک وطن کے دفاع اور عظمت کے لئے جی جان سے لڑتے رہیں گے۔
آخری قطرہ خون تک کاری ضرب لگاتے رہیں گے۔
کاری ضرب۔ ضرب حیدری۔ ضرب اللہ اکبر۔
نوید فتح تک۔ فتح مبین۔ آخری فتح تک۔
کمال پور کے مجاہدو۔ دلاورو۔ جانبازو۔ دلیرو۔
ہمیں تمہاری جرأتوں کی قسم۔
ہمیں تمہارے حوصلوں کی قسم۔
ہمیں تمہارے ولولوں کی قسم۔
ہمیں تمہاری استقامت کی قسم۔
ہمیں تمہارے استقلال کی قسم۔
کہ کسی دشمن کے ناپاک ارادے کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔
ہم برہمن رام راج اور چانکیہ کے چیلوں کی مکاری اور عیاری سے پھیلائی ہوئی آگ کو ان کی چِتا اور آخری چِتا بنا دینگے۔
ہم برہمنوں کی پیٹھ ٹھونکنے والے سوشل سامراج کی تمام سازشوں کو تہس نہس کر دیں گے۔
ہم اپنے وطن کی سالمیت اور خود مختاری کے تمام دشمنوں کو ملیا میٹ کر دیں گے۔
تمہاری جرأت ہمارے لئے نقشِ دوام ہے۔
تمہاری استقامت، ہماری تاریخ کا روشن باب ہے۔
تمہارا جذبۂ حریت، ہماری نسلوں کی امانت ہے۔
کمال پور کے جانبازو۔ ہمارے دلوں کی گہرائیاں تمہیں سلام کہہ رہی ہیں۔

لیکن کمال پور کے جیالے جیسور کے شہہ زور ہی کے جوانمرد اپنوں ہی کی سازش کا شکار ہو گئے۔
اور آج پاکستان کی بیٹیاں، پاکستان کی بہنیں، پاکستان کی مائیں درد کے اس کڑے رشتے کے باوجود اے نوجوانانِ وطن۔ اے غیرت مندانِ قوم۔ اے رہبرانِ ملت، اے مسندِ نشینانِ خیر البشر، تم سے سوال کر رہی ہیں کہ تمہاری جمعیت کو کیا ہوا۔ تمہاری غیرت کو کیا ہوا۔ یہ جیالے، یہ شہہ زور۔ یہ وطن کی آبرو۔ یہ وطن کی آبرو پر مر مٹنے والے کب تک اغیار کی قید میں تمہارا منہ دیکھیں گے —؟
جاگ میرے وطن! جاگ ہمارا سفر بڑا طویل ہے۔ ہماری راہ بڑی کٹھن ہے۔ اور شائدان بیٹیوں۔ ان ماؤں۔ ان بہنوں کی آواز سنو!۔

نظر آتی ہے کہ اُسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکمرانوں کی طرح اس دھرتی کے انسانوں سے کوئی سروکار نہیں بلکہ وہ اپنے سامراجی مفادات میں دلچسپی رکھتا ہے اور ان مفادات کی تکمیل کے لئے پہلے ایسے ہی حالات پیدا کئے جاتے ہیں۔

بنگلہ دیش کا قیام جہاں پاکستان کی یحییٰ فوجی جنتا اور متحدہ پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کی غلط حکمتِ عملی کی وجہ سے عمل میں آیا ہے، وہاں اس کے بین الاقوامی مضمرات بھی کارفرما رہے ہیں۔ اصل میں پاکستانی فوج کے سپاہی اپنے اقتدار پرست جرنلوں اور سیاست دانوں کی شعبدہ بازیوں اور عوام دشمن پالیسیوں کا شکار ہوئے۔ فوج کا سپاہی اپنے طبقاتی کردار کے لحاظ سے مزدوروں اور کسانوں کا بیٹا ہے۔ موجودہ نظام کے تحت اپنے بالا افسر کے حکم کی تعمیل اس کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ فوج کے سپاہی کو بنگلہ دیش میں کی جانے والی کارروائیوں کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا، وہ خود اس طبقے کی سازش کا شکار ہوا ہے جو پاکستان پر گزشتہ ۲۶ سالوں سے حکمرانی کر رہا ہے۔

حکمرانوں کی جس ناعاقبت اندیشی، غلط پالیسیوں اور عوام دشمن کردار کی وجہ سے بنگلہ دیش قائم ہوا ہے اور جس وسیع پیمانے پر بنگالی بھائیوں کو جماعت اسلامی کی البدر اور الشمس نے ظلم و ستم اور بربریت کا نشانہ بنایا۔ اس کی جس قدر بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ اور اسی طرح عوامی لیگ کی قیادت میں مکتی باہنی نے جو مظالم غیر بنگالیوں پر روا رکھے، ان کی بھی اس قدر مذمت لازم ہے۔ یہ عجب مذاق ہے کہ قصور یحییٰ حکومت اور متحدہ پاکستان کی سیاسی جماعتوں کا ہے، مگر سزا ان ترانوے ہزار جنگی قیدیوں اور ان کے عزیز و اقارب کو مل رہی ہے، جو محض اس نظام کی وجہ سے اپنے سرکاری فرائض ادا کرنے پر مجبور تھے۔

جنگی قیدیوں کی بیشتر تعداد کا تعلق پاکستان کے بڑے صوبے پنجاب سے ہے۔ سیلاب کی حالیہ تباہ کاریوں نے اس صوبے کی غمناک فضا کو اور زیادہ شدت سے ہمکنار کر دیا ہے۔ پہلے تو پنجاب کے باسی اپنے جنگی قیدیوں کے بارے میں فکرمند رہتے ہوں گے اور اب دیارِ غیر میں جنگی قیدیوں کو یہ پریشانی لاحق ہوگی کہ پتہ نہیں، سیلاب میں اُن کے خاندان پر کیا گزری ہوگی۔ کون زندہ بچا ہوگا اور کونسا چراغ بجھ گیا ہوگا۔ اندازہ لگایئے کہ جو آنکھیں اپنے ابّو کے انتظار میں پتھرا گئی تھیں، خدا نہ کرے ان میں سے کوئی ہمیشہ کے لئے گہری نیند سو گیا ہو تو ابّو پر واپسی کے بعد کیا گزرے گی۔

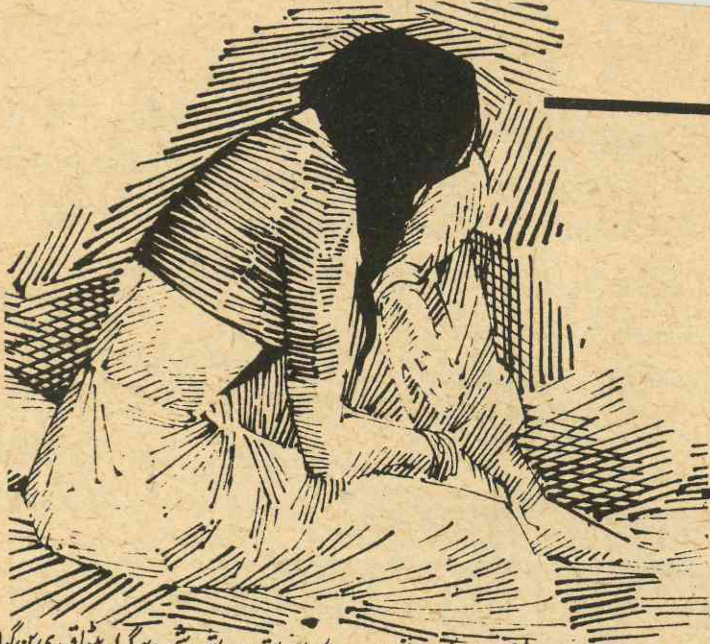
آج کل انٹر سروسز پبلک ریلیشنز بورڈ بلوچستان کے بارے میں بھی جو پریس ریلیز جاری کر رہا ہے کہ "ایک فوجی ہلاک، دو شرپسند مارے گئے۔" یہ کیا ہو رہا ہے، ہمارے سیاست دانوں کو بنگلہ دیش سے عبرت حاصل کرنی چاہیئے۔ یحییٰ فوجی حکمران تھا، آج تمام تر ذمہ داری اُس پر عائد کی جا سکتی ہے کہ وہ اقتدار سے محروم ہے، لیکن کل بلوچستان میں بھی وہی کچھ ہوا، جو بنگلہ دیش میں ہو چکا ہے تو ذمہ داری کس پر ڈالی جائے گی۔ بلوچستان کے عوام کی حب الوطنی شک و شبے سے بالاتر ہے۔ خیر بخش مری، عطاء اللہ مینگل، غوث بخش بزنجو، گل خان نصیر اور دوسرے سیاستدان، بلوچ عوام کے منتخب نمائندے ہیں۔ اور شیر محمد مری جس نے ایوبی آمریت کا جوانمردی، دلیری اور شجاعت سے مقابلہ کیا، وہ ملک دشمن نہیں۔ ان کے خلاف حالیہ اقدامات بلوچستان کی فضا کو بگاڑنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

ہم سوچ نہیں سکتے کہ فوجی حکمرانوں کے خلاف ایک طویل جدوجہد کرنے والا ذوالفقار علی بھٹو بلوچستان میں سیاست کی بجائے فوجی کارروائی سے کام لے گا۔

ہم سوچ نہیں سکتے کہ اقتدار میں آنے سے پہلے جناب ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے خاندان کی قابلِ احترام شخصیات کی نجی زندگی کے بارے میں من گھڑت اور بے بنیاد کہانیوں کی اشاعت کے بعد جو عوامی ردِّ عمل ہوا تھا، اس کے باوجود آج سرکاری اخبارات بلوچ رہنماؤں اور اُن کے خاندان کے افراد سے متعلق ان سے گھٹیا، غیر مہذب اور غیر اخلاقی، من گھڑت، خیالی اور بے بنیاد کہانیاں شائع کریں گے۔

ہم سوچ نہیں سکتے کہ ان تحریروں کی وجہ سے پاکستان کی صحافت میں ایک بار پھر وہی طوفان آ جائے گا کہ اخبارات نجی زندگیوں میں گندگی اچھالیں گے اور مقام و منصب کو بالائے طاق رکھ دیں گے۔

باقی صفحہ ۶۶ پر۔



انتظار

افسانہ

نعیم آردی

اسٹیشن والی سڑک دوپہر کی گرد آلود دھوپ میں تپ رہی تھی. چھوٹے سے کچے راستے پر خاک کے بگولے اُٹھ رہے تھے. درختوں کی ٹہنیاں گرم ہوا کے تیز جھکڑ سے خشک ہو ہو کر لٹک گئی تھیں. ابھی دن کے گیارہ بجے تھے. لیکن اسٹیشن سے آنے والی کچی سڑک مردے کی آنکھ کی طرح ویران ہو گئی تھی۔

لاہور کی گاڑی پونے دس بجے آ کر چلی گئی تھی. تانگے والے سواریاں اٹھا کر گاؤں چلے گئے تھے. گاڑی کی روانگی کے نصف گھنٹے بعد تک اکا دکا تانگے والے بھی بچی کھچی سواریاں اٹھا کر کچے راستے پر ٹخ ٹخ کرتے ہوئے گزر گئے تھے. آخری تانگہ اچّو کوچوان کا تھا. اس نے شیشم کے درخت کے نیچے بیٹھی ہوئی پریشان حال مائی صدیقہ کو دیکھ کر چلایا۔ ”او مائی گھر جا، اب اسٹیشن سے کوئی نہیں آئے گا. تیرا جوان پتر آج بھی نہیں آیا۔“

مائی صدیقہ شاید آخری تانگہ والے کے انتظار میں بیٹھی تھی. اس نے خالی خالی نگاہوں سے اچّو تانگہ والے کی طرف دیکھا. اور خاموشی سے اُٹھ کر گاؤں کی جانب چل دی. مٹی کے کچے کچے مکانات گرد کے بگولوں میں چھپ گئے تھے. اور دور سے کانپتے ہوئے دھبے کی طرح نگاہوں میں چبھنے لگے تھے. مائی صدیقہ نے ایک بار پھر پلٹ کر اسٹیشن والی سڑک پر نظریں دوڑائیں. مگر ناچتے ہوئے بگولوں کی دھند میں لپٹی ویران اور سنگدل سڑک نے اس کی جانب مایوسی کے کانٹے اچھال دیئے. اس کا جوان بیٹا کریم الدین آج بھی واپس نہ آیا۔

وہ معمول کے مطابق بیٹے کے انتظار کا کرب اپنے دل میں سمیٹے مٹی کے کچّے گھروندوں کی جانب بڑھتی گئی. اچّو کوچوان نے ہوا میں چابک لہراتے ہوئے اپنی سواری سے کہا. مائی صدیقہ ہر روز صبح سویرے شیشم کے درخت کے نیچے اپنے بیٹے کا انتظار کرتی ہے. کریم الدین محاذ پر گیا تھا. دشمن کے نرغے میں گھر کر قیدی بن گیا. بہت دنوں تک اس کی اطلاع نہیں ملی. ایک دن فوجی ہیڈ کوارٹر سے اس کا خط آیا. جس میں لکھا تھا. تمہارا بیٹا کریم الدین دشمن کا قیدی بن گیا ہے. وہ زندہ سلامت ہے۔

مائی صدیقہ اور گاؤں والے اسے شہید سمجھ بیٹھے تھے. بڑھیا بیٹے کے غم میں پاگل ہو گئی تھی. پھر فوجی ہیڈ کوارٹر سے اچانک اس کی سلامتی کا خط آیا تو مائی صدیقہ جی اُٹھی. کریم الدین اس کی کل کائنات ہے. اس کا شوہر پچھلی جنگ میں محاذ پر گیا تھا. ایک گولہ آ کر پھٹا اور اس کے چیتھڑے اُڑ گئے. حکومت نے اسے بہادری کا تمغہ دیا تھا. گاؤں والے مائی صدیقہ کی بڑی عزت کرتے تھے. لیکن بیٹے کی جدائی نے اسے پاگل بنا دیا. اب گاؤں والے اس کی کچھ زیادہ خبر گیری نہیں کرتے. کسی نے کچھ دے دیا تو کھا لیتی ہے. ورنہ منہ چھپا کر کسی کونے میں سو رہتی ہے. شوہر شہید ہو گیا. بیٹا قیدی بن گیا. وہ اس بھری دنیا میں تنہا رہ گئی. ہر ماہ اسے حکومت کی جانب سے شوہر کی پنشن اور بیٹے کی تنخواہ کی جو تھوڑی بہت رقم ملتی ہے، اس کے رشتہ دار اُڑا لیتے ہیں. پاگل بڑھیا کو اس کا ذرا برابر ملال نہیں ہے. وہ تو گاؤں والوں سے صرف ایک ہی سوال پوچھتی پھرتی ہے۔

”میرا سوہنا پتر کدوں آوے گا. اُہدی کوئی خبر اے۔“

اچّو نے گھوڑے کی دُم مروڑتے ہوئے کہا۔ ”پہلے تو لوگ اسے دلاسہ دیتے تھے. مگر اب اس کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیتا. گاؤں والے بھی کیا جواب دیں، انہیں خود نہیں معلوم کہ وہ کب آئے گا. کرمو بڑا لائق بیٹا تھا. وہ اپنی ماں کا بڑا خیال رکھتا تھا. اس نے بھینس پال رکھی تھی اور صبح ہی صبح اس کا دودھ دوہنے میں اپنی ماں کی مدد کرتا تھا. بھینس کے لئے چارہ کاٹتا اور بازار سے سودا سلف لاتا تھا۔“ اُچّو نے گھوڑے کو چابک رسید کرتے ہوئے کہا۔ ”کرمو کی بہت ساری باتیں میں جانتا ہوں. وہ میرے بچپن کا دوست تھا. باپ کی طرح بڑا جیالا اور مرد آدمی تھا۔“

تانگہ اسٹینڈ پر پہنچ کر سواری نے پہلی بار زبان کھولی. تم نے مائی صدیقہ کو اپنے تانگہ پر کیوں نہیں بٹھایا؟ اُچّو کوچوان نے گھوڑے کو تھپکیاں دیتے ہوئے جواب دیا — ایک بار نہیں سو بار کوشش کر چکا ہوں، مگر وہ بیٹھتی ہی نہیں. اس کے تلوئے میں آبلے پڑ جاتے ہیں. درد سے چیختی چلاتی ہے.

مگر کسی کو زخموں پر ہاتھ لگنے نہیں دیتی۔ شاید وہ اپنے بیٹے کے غم میں کسی کو شامل کرنا پسند نہیں کرتی۔ وہ سارے گھاؤ اپنے سینے میں کھانا چاہتی ہے۔ جب اس کا بیٹا واپس آئے گا تو وہ اس اس سے کہے گی۔ "پتر دیکھ تیرے انتظار وچ کتنے زخم سہنے پئے ۔"

ایک دن گاؤں میں خبر پہنچی کہ بہت سے بیمار اور زخمی قیدی واپس آ گئے۔ کسی نے جا کر مائی صدیقہ کو خبر کر دی شاید تیرا بیٹا بھی آجائے۔ اس کی سنسان آنکھوں میں یکدم زندگی کی چمک لہرا گئی۔ "کرمو آ گیا۔ کرمو آ گیا"۔ وہ بڑبڑائی۔

"آیا نہیں مائی صدیقہ۔ آجائے گا۔ کل یا پرسوں۔ تو کسی سے معلوم تو کر"۔ خوشخبری سنانے والا چلا گیا۔ مائی صدیقہ سامنے سے گزرنے والے ہر شخص کا دامن تھام کر سوال کرتی۔ "میرا سوہنا پتر کدوں آوے گا۔ اُہدی کوئی خبر اے"؟

دوسرے وہ صبح ہی صبح اپنی میلی چادر اوڑھ کر اسٹیشن والی سڑک پر روانہ ہو گئی۔ میل بھر چلنے کے بعد وہ تھک کر کنارے پر بیٹھ گئی۔ اجو حسب معمول ادھر سے گزر رہا تھا۔ مائی صدیقہ کو اس عالم میں دیکھ کر رُک گیا اور بڑے پیار سے مائی صدیقہ کو ٹانگہ پر سوار کرنے کی کوشش کی، مگر وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس نے حیران اور تھکی تھکی آواز سے سوال کیا۔ "میرا کرمو کتھے اے، اُہدی کوئی خبر اے"؟

اجو کیا جواب دیتا۔ مائی صدیقہ کو اسی عالم میں چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ گاڑی کی آمد میں تھوڑا سا وقت باقی رہ گیا تھا۔

گاڑی اسٹیشن پر آ کر رُک گئی۔ پلیٹ فارم پر تھوڑی سی چہل پہل ہو گئی۔ خوانچہ والوں نے آوازیں لگانی شروع کر دیں۔ چند مسافر اترے اور گیٹ سے باہر نکل کر ٹانگہ والوں کے نرغے میں پھنس گئے۔ اجو کوچوان بھی زور زور سے اپنے گاؤں کا نام لے کر چلا رہا تھا، مگر اس کی جانب کوئی نہیں آیا۔ خوش قسمت کوچوان اپنے ٹانگوں پر سواریاں بٹھا کر منزل مقصود کی جانب روانہ ہو گئے۔ اجو کا گلا چلا چلا کر بیٹھ گیا۔ تب جا کر کہیں اسے دو سواریاں ملیں۔ اس میں سے ایک مرد اور ایک عورت تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی تھے۔ مرد نے اجو کو بتایا وہ لاہور سے آ رہے ہیں۔

اجو بہت خوش ہوا۔ اس نے فوراً پوچھا۔ "کچھ ہمارے جنگی قیدیوں کا حال سناؤ، کب واپس آئیں گے۔؟

لاہور سے آنے والے مسافر نے اداس لہجے میں جواب دیا۔ "بھارت گن گن کر بدلے لے رہا ہے۔ شرطیں لگا رہا ہے۔ کچھ پتا نہیں ہمارے قیدی کب واپس آئیں گے۔"؟

اجو نے مائی صدیقہ کی بپتا سنائی۔ مسافر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے کانپتی آواز سے کہا۔ "بڑا گہرا زخم ہے۔ پورا ملک اس صدمہ سے نڈھال ہے۔"

ٹانگہ جب اسٹیشن سے گاؤں جانے والی سڑک کے موڑ پر پہنچا تو اجو نے انگلی کے اشارے سے مسافر کو بتایا۔ "وہ دیکھو، درخت کے نیچے مائی صدیقہ اپنے سوہنے پتر کا انتظار کر رہی ہے۔ اسے امید تھی کہ آج اس کا بیٹا ضرور آئے گا۔ مگر وہ نہ آیا۔ آج تو وہ بہت پریشان تھی۔ رب خیر کرے۔"

ٹانگہ مائی صدیقہ کے قریب سے گزرا تو اس نے بڑی امید بھری نظروں سے اجو کوچوان کو دیکھا۔ اجو کا دل تڑپ اُٹھا، مگر وہ کیا کرتا۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ کرم الدین کو اٹھا کر اس کی گود میں ڈال دیتا۔ اس نے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہوئے کہا۔ "مائی گھر چل تیرا پتر بس دو چار دناں نوں آجاوے گا۔ فکر نہ کر۔"

مائی صدیقہ نے اسے اجنبی نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔ "چل جاہ اج میں اِسے تھاں تے اپنے پتر دا انتظار کراں گی۔"

اجو کوچوان نے کچھ دیر مائی صدیقہ کی خوشامد کی، مگر وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی۔ تھک ہار کر وہ ٹانگے پر بیٹھ گیا۔ جھنجھلاہٹ میں گھوڑے کی پیٹھ پر زوردار چابک رسید کیا اور گرد کے بگولے اڑاتا گاؤں کی جانب روانہ ہو گیا۔

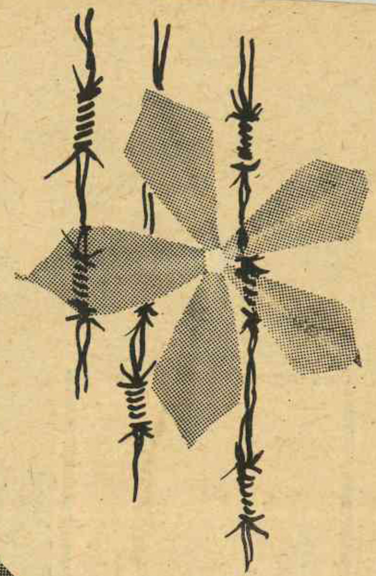
مائی صدیقہ ابھی تک اسٹیشن سے آنے والی سڑک کو امید بھری نظروں سے گھور رہی تھی۔ ■

بقیہ : معراج محمد خان

ہے کہ وہ وفاقی حکومت کو فوجی کارروائی سے باز رکھنے کے لئے زور دے۔ ورنہ بلوچستان میں بھی "جنگی قیدیوں کا مسئلہ" پیدا ہو سکتا ہے۔ آئیے آج ہم سب عہد کریں کہ اپنے حکمرانوں کو سیاسی مقاصد کے لئے عوام کے خلاف مسلح افواج کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔

ملک کی جغرافیائی حدود، سلامتی اور آزادی کا تحفظ کرنا پوری قوم کا اولیں فرض ہے، لیکن ملک کا دفاع اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک فوج کے ساتھ ساتھ عوام کو متحرک نہیں کیا جاتا، اور فوج اور عوام کے درمیان ہم آہنگی پیدا نہیں کی جاتی، پاکستان کے دفاع کو مضبوط اور ناقابل تسخیر بنانے کے لئے ضروری ہے کہ آلاتِ حرب اور اسلحہ کے سلسلے میں ملک کو خود کفیل بنایا جائے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارا حکمران طبقہ غیر ملکی فوجی امداد اور فوجی معاہدوں کے بل بوتے پر ملک کا دفاع کرنا چاہتا ہے حالانکہ پوری قوم جانتی ہے کہ غیر ملکی فوجی امداد اور معاہدوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی جنگوں کے دوران ہمارے فوجی اتحادیوں نے ہمیں اسلحہ دینے سے انکار کر دیا۔ فوجی امداد روک دی اور فوجی معاہدے حرکت میں نہیں آئے۔ اس کے علاوہ قومی آزادی اور دفاع کا تحفظ اس وقت ناممکن ہے جب تک موجودہ استحصالی نظام کا خاتمہ نہیں کیا جاتا اور سوشلزم کے پرچم تلے ملک اور قوم کو ترقی اور خوشحالی کی راہ پر گامزن نہیں کیا جاتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پوری پاکستانی قوم کی ہمدردیاں اپنے جنگی قیدیوں اور ان کے مظلوم خاندانوں کے ساتھ ہیں میں اپنی قوم کی بہو بیٹیوں، ماؤں اور بہنوں سے دردمندانہ اپیل کرتا ہوں کہ وہ عظیم قومی سانحہ پر صبر و تحمل سے کام لیں اور برسرِ اقتدار گروہ کے گھناؤنے مفادات اور مقاصد کی تکمیل کی خاطر اپنی مظلوم لیکن غیور اور بہادر قوم کو مزید یوں رسوا نہ کریں کہ دوسرے ممالک کے عوام ہمارا تمسخر اڑائیں میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے جب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے جنگی قیدیوں کے خاندانوں سے وابستہ خواتین۔ جو پوری قوم کی عزت ہیں دوسرے ممالک کے عوام اور رہنماؤں کے سامنے جنگی قیدیوں کی رہائی کے لئے دامن پھیلا پھیلا کر گڑگڑاتی اور زار و قطار روتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں اس قسم کے انداز سے ہماری مسلح افواج، ہمارے جنگی قیدیوں اور پوری قوم کا وقار مجروح ہوتا ہے۔





بھارتی چھاتہ بردار سامان بردار طیاروں کے ذریعہ ڈھاکہ کے علاقہ میں اتر رہے ہیں

ڈھاکہ کی جنگ

میجر جنرل جمشید نے مورچہ کا دفاع چھوڑ دیا تھا

ڈھاکہ میں بھارت کی پہلی بٹالین دس بجکر چالیس منٹ پر داخل ہوئی

دلیپ مکرجی - ترجمہ جاوید احمد

۹ دسمبر ۱۹۷۱ء یعنی پاک و ہند جنگ کا ساتواں دن پاکستانی جنرلوں کے لئے لمحہ فکریہ لایا۔ اس دن بھارتی فوج کی ایک کمپنی نے اکھورہ سے برہمن باڑیہ کے راستے اسوج گنج کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ اسوج گنج ایک دریائی بندرگاہ ہے جو ڈھاکہ سے ۸۰ کلومیٹر شمال مشرق میں دریائے میگھنا پر واقع ہے۔

اگرچہ دریائے میگھنا کو عبور کرنا نہایت مشکل اور وقت طلب مرحلہ تھا۔ پاکستانی جنرل سمجھتے تھے کہ بھارتی فوج کو میگھنا عبور کرنے میں تین چار دن لگیں گے۔ لیکن دوسرے دن انہیں یہ جان کر حیرت ہوئی کہ بھارتی فضائیہ کے ہیلی کاپٹروں نے ۲۴ گھنٹے کے اندر اندر ایک پورا بریگیڈ، ۹ توپوں اور دیگر آلات حرب اور اشیائے خورد و نوش کو دریائے میگھنا کے پار پہنچا دیا۔

ایک دوسری بھارتی فوجی کمپنی نے داؤد کنڈی پر قبضہ کر لیا۔ یہ قبضہ دریائے میگھنا پر اسوج گنج کے جنوب میں ڈھاکہ سے ۴۰ کلومیٹر پر واقع ہے۔ یہ کمپنی "بنگلہ دیش" کے شمال میں کومیلا کے پاکستانی فوج کے ڈویژنل ہیڈ کوارٹر کو فتح کرتے بغیر برق رفتاری سے داؤد کنڈی کی طرف بڑھی تھی۔ اس نے کومیلا سے داؤد کنڈی آنے والی سڑک پر مضبوط رکاوٹ کھڑی کر دی تاکہ پاکستانی فوج اس کا تعاقب نہ کر سکے۔

بھارتی فوج کی تیسری کمپنی نے چاندپور پر قبضہ کر لیا۔ فوجی اعتبار سے چاندپور کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ ڈھاکہ اور چاٹگام کے درمیان دریائی آمدورفت اسی جگہ سے ہوتی ہے۔ اسی طرح بھارتی فوج نے ۹ دسمبر کو تری پورہ سرحد سے ۷۰ کلومیٹر کے علاقہ پر قبضہ کر لیا اور ۱۰ دسمبر کو لکشم تک پہنچ گئی۔

مشرقی سرحد پر جو خطرات پیش آ رہے تھے ان کے پیش نظر جنرل شمال مغرب میں تبدیلیوں کا جائزہ لے رہے تھے۔ مکتی باہنی اور بھارتی افواج نے جمال پور پر قبضہ کر لیا۔ جو سرحد سے ۴۵ کلومیٹر اندر واقع تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تنگیل اور



میجر جنرل جمشید ہتھیار ڈالنے کے بعد بھارت کے میجر جنرل ناگرا اور بریگیڈیئر ایچ ایس کلر کے ساتھ



"البدر" نے مشرقی پاکستان کے ۲۵۰ ڈاکٹروں، وکلا، صحافیوں اور اساتذہ کو قتل "کر دیا"

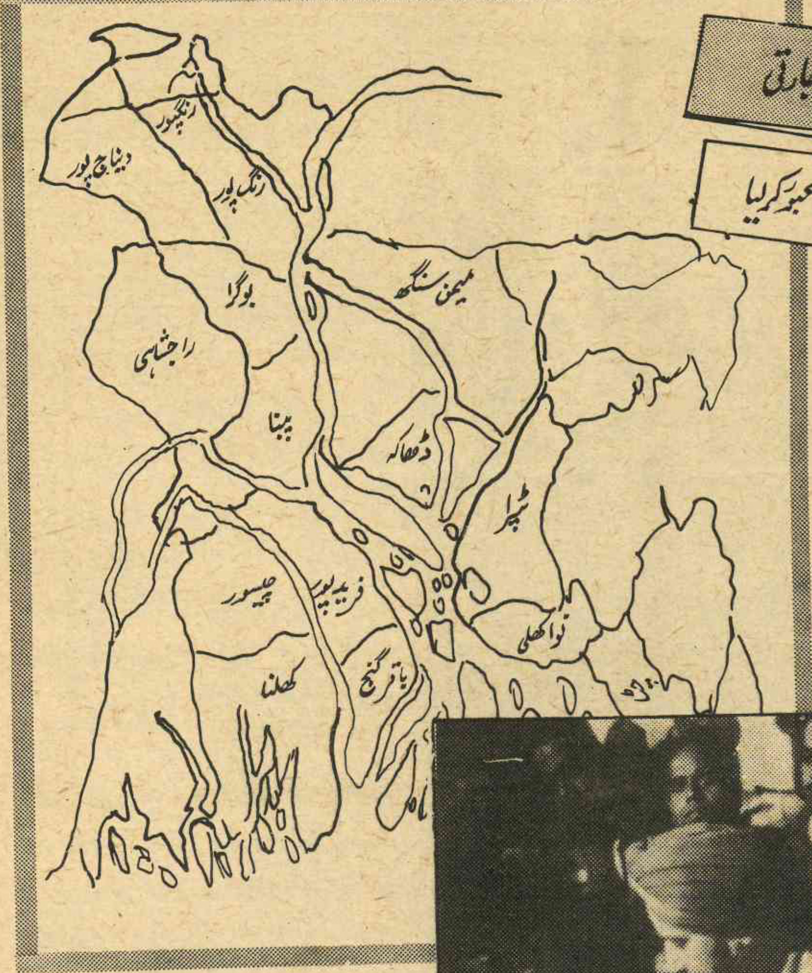
جودیا پور کے راستے بذریعہ سڑک ڈھاکہ کی جانب بڑھیں گی۔ مغرب میں کمر کھالی گھاٹ کے مقام پر جو دریائے مادھومتی پر واقع ہے۔ پاکستانی افواج دباؤ ڈال رہی تھیں، کیونکہ اگر ہندوستانی فوج دریائے مادھومتی کو عبور کر لیتی تو فرید پور ضلع پر، اس کا لازمی طور پر قبضہ ہو جاتا۔ قصہ مختصر یہ ہے کہ ان حالات کے مدِ نظر جنرل نیازی آسانی سے اندازہ لگا سکتے تھے کہ ان کے لئے کیا رہ گیا ہے۔

ڈھاکہ کے دونوں ہوائی اڈے تیج گاؤں اور کرمی ٹولہ بھارتی فضائیہ کی زد میں تھے۔ بھارتی بمباروں نے انہیں سخت نقصان پہنچایا۔ یہ ہوائی اڈے قابلِ مرمت تھے۔ لیکن ان کی مرمت کے لئے ضروری تھا کہ بھارتی فضائیہ بمباری بند کر دے۔ مگر بھارتی فضائیہ لگاتار حملے کر رہی تھی۔ اور پاکستانی فوج کو ہوائی اڈوں کی مرمت کی مہلت نہیں دے رہی تھی۔

جنرل نیازی کی ایک اور بدقسمتی یہ تھی کہ پاکستانی بحریہ کے جنگی جہاز اور طیارہ بردار جہاز چاٹگام اور کاکس بازار میں پھنسے ہوئے تھے۔ بھارتی بحریہ نے ان کے گرد مضبوط حصار بنا لیا تھا۔ فوج کو لانے اور لے جانے والی لانچوں پر بھارت شدید بحری اور ہوائی حملے کر رہا تھا۔ ان شدید حملوں کی وجہ سے نہ تو ڈھاکہ میں مزید پاکستانی فوج داخل ہو سکتی تھی اور نہ ہی ڈھاکہ سے نکل سکتی تھی۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے ۱۰ دسمبر کو جنرل راؤ فرمان علی نے اقوام متحدہ سے "امن اور جنگ بندی" کے لئے رجوع کیا تھا۔

ڈھاکہ میں مقیم غیر ملکیوں نے اپنے انخلاء پر زور دیا۔ شدید بمباری کی وجہ سے ان کا انخلاء ناممکن تھا۔ ہندوستان بمباری بند نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب اس مطالبے نے زور پکڑا تو بھارت اس شرط پر ۲۴ گھنٹے کے لئے بمباری بند کرنے پر رضامند ہوا کہ مسافر بردار طیارے کچھ دیر کے لئے کلکتہ ٹھہریں گے۔ تاکہ بھارتی حکام یہ اطمینان کر لیں کہ ان مسافروں میں کوئی پاکستانی تو نہیں ہے۔ اس فیصلے کے بعد ۲۴ گھنٹے کے لئے بمباری بند کر دی گئی۔ رن وے کی مرمت ہوئی اور ۱۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو ۳۵۰ غیر ملکی ڈھاکہ سے روانہ ہو گئے۔

اسی اثناء میں مکتی باہنی اور بھارتی فوج نے اپنا دباؤ بڑھائے رکھا۔ چاندپور سے ایک کمپنی شمال مشرق میں ڈھاکہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ تاکہ وہ داؤدکنڈی میں مقیم بھارتی فوج سے مل سکے۔ اسوج گنج کے مقام پر دریائے میگھنا کو عبور کرنے کے بعد بھارتی فوج کی رفتار اور بڑھ گئی۔ کیونکہ اس نے مزید اسلحہ بھی دریا کے دوسری طرف منتقل کر لیا تھا۔ درمیانی سائز کی توپوں کو کھول لیا گیا تھا تاکہ نقل و حرکت میں آسانی رہے۔ یہ یوں بھی ضروری ہو گیا تھا۔ کیونکہ پاکستانی فوج نے دریا پر تمام بند اور پل توڑ دیئے تھے — یہ بات بھارتی فوج کے لئے غیر متوقع تھی۔ کیونکہ اس سے پل کا وہ



پاکستانی جنرلوں کی توقع کے خلاف بھارتی

فوج نے ۲۴ گھنٹوں میں دریائے میگھنا عبور کرلیا

سلسلہ بھی منقطع ہوگیا تھا جو ڈھاکہ اور چاٹگام کے درمیان تھا۔
۱۱ دسمبر کو بھارتی فضائیہ نے تنگیل کے علاقے میں چھاتہ بردار فوج بمعہ اسلحہ اتار دی۔ بعد میں لیفٹیننٹ کرنل بینول نے بتایا کہ سینکڑوں مقامی باشندوں نے اسلحہ جمع کرنے میں مدد دی جو فضا سے گرایا جارہا تھا۔ ۷۵ ملی میٹر کی توپیں بھی اتاری گئیں۔ چھاتہ بردار فوج اتارنے کا پروگرام اچانک نہیں بنایا گیا تھا بلکہ یہ پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ بقیہ بٹالین آنے سے قبل چھاتہ بردار،



ذرائع نقل و حمل اور پلوں کی حفاظت کریں تاکہ وہ فوج جو جمال پور سے شمال جنوب میں بڑھ رہی تھی اسے رکاوٹ نہ ہو۔ یہ مرحلہ کامیابی سے طے ہوگیا۔ اس کے علاوہ اس بٹالین نے شمال کی طرف سے پسپا ہونے والی پاکستانی فوج کو ڈھاکہ داخل ہونے سے بھی روکا۔

یہ مرحلہ ختم کرنے کے بعد بھارتی فوج بحر آب بازار سے نرسنگدی کی طرف بڑھی اور اسے ۱۱ دسمبر کو فتح کرلیا۔ یہ قبضہ ڈھاکہ سے ۳۵ کلومیٹر کے فاصلہ سے ڈھاکہ اور بحر آب بازار کے درمیان واقع ہے۔ ایک اور دریا عبور کرنے کے بعد بھارتی فوج یہ کہہ سکتی تھی کہ ڈھاکہ کی جنگ شروع ہوچکی ہے۔ یہاں تک کہ ریڈیو پاکستان نے بھی یہ تسلیم کرلیا کہ صورتحال تشویشناک ہے۔ لیکن اب بھی جنرل نیازی غیر ملکی نمائندوں کو یہ یقین دلارہے تھے کہ وہ آخری دم تک لڑیں گے۔ انہوں نے کہا کہ "آپ لوگ مجھے آگے بڑھتا پائیں گے یا آپ میری لاش دیکھیں گے"۔ غالباً یہ ان کا جنرل مانک شاہ کو جواب تھا، جس میں اس نے جنرل نیازی کو ہتھیار ڈالنے کو کہا تھا۔

بھارتی فوج کے سربراہ نے کہا کہ ہوائی اور بحری راستے سے فوج کا انخلاء ناممکن ہوگیا تھا۔ مغربی پاکستان سے رسد پہنچانا بھی ناممکن تھی۔ ان حالات میں پاکستانی فوج کے لیے جدوجہد جاری رکھنا لاتعداد فوجیوں کی جانیں ضائع کرنے کے مترادف تھا۔ یہی وہ وقت تھا کہ مغربی پاکستان کے باشندوں اور ان کی بیوی بچوں کی جانیں بچانے کے لیے ضروری ہوگیا تھا، کہ پاکستانی فوج یہ ذمہ داری بھارتی فوج اور مکتی باہنی کو سونپ دے ورنہ پھر حالات اور بھی مخدوش ہونے کے امکانات تھے۔

جنرل نیازی نے بعد میں یہ تسلیم کیا کہ اس کو جنرل یحیٰی

بھارتی فوج کے دباؤ سے گھبرا کر گورنر مالک نے استعفیٰ دیدیا



پاکستانی فوجی ہتھیار ڈال رہے ہیں

خان نے دھوکہ دیا تھا۔ بی بی سی کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ مجھے یقین دلایا گیا تھا کہ امریکہ اور چین پوری طرح جنگ میں شریک ہوں گے۔ مگر آخری وقت تک ایسا نہ ہوا۔ بلکہ پاکستانی پروپیگنڈہ فوج کو یہ یقین دلاتا رہا کہ عنقریب "بڑی تبدیلی" ہونے والی ہے۔

پروپیگنڈہ جاری رہا۔ آخری وقت تک مشرقی پاکستان میں مقیم فوجوں کو باہر سے کوئی مدد نہ ملی۔ بھارتی فوج کی وہ بٹالین جو نرسنگدی کی طرف سے بڑھ رہی تھی۔ اس نے ۴۸ گھنٹے کے بعد ڈرما پر قبضہ کر لیا، جو ڈھاکہ کے شمال مشرق میں ایک نواحی صنعتی علاقہ ہے۔ جنوب میں جو فوج جمال پور کی طرف سے آگے بڑھ رہی تھی وہ تنگیل میں چھاتہ بردار دستوں سے آکر مل گئی۔ اس کے بعد ان دستوں نے جو دیا پور کی طرف بڑھنا شروع کیا جو جنوب مشرق میں ۵۰ کلومیٹر اندر کی طرف ہے۔ یہ ہی وہ مقام ہے جہاں ۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ کو سب سے آخری معرکہ ہوا۔

اس کے علاوہ چند اور بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ بھارتی فوج نے آگے بڑھتے ہوئے تنگیل کا کنٹرول سنبھال لیا، جو ڈھاکہ سے دس کلومیٹر پر ہے۔ نرسنگدی کی طرف سے بڑھنے والی بھارتی فوج اب ڈھاکہ سے صرف ۱۲ کلومیٹر کے فاصلے پر تھی اور ڈھاکہ کی طرف شمال مشرقی سمت سے بڑھ رہی تھی۔

ان تمام معرکوں میں جو افسران جنگی قیدی بنے تھے، ان میں ۹۳ پیادہ فوج کے کمانڈر بریگیڈیئر خاور خان، دو لیفٹیننٹ کرنل، ایک سیکٹر کمانڈر اور ایک مارشل لاء کا ضلعی ناظم شامل تھے۔

بھارتی فوج کے بڑھتے ہوئے دباؤ سے گورنر مالک اپنے حواس کھو بیٹھے اور انہوں نے ۱۴ دسمبر کو اپنی "کابینہ" کا ایک خصوصی اجلاس بلایا تا کہ صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے۔ بدقسمتی ملاحظہ ہو کہ بھارتی جاسوسوں کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ اور عین اجلاس کے وقت بھارتی فضائیہ نے گورنر ہاؤس پر حملہ کر دیا۔ ایک غیر ملکی نامہ نگار لکھتا ہے کہ اس فضائی حملہ نے کام تمام کر دیا۔ اور ایک پناہ گاہ میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر مالک نے بی بی سی کے نمائندے سے قلم لے کر اپنا استعفےٰ صدر پاکستان کے نام لکھا۔ گویا اب تماشہ ختم ہو چکا تھا۔

گورنر کے استعفےٰ دینے کے بعد اس کے وزراء اور دوسرے اعلیٰ سول حکام نے اس کی پیروی کی اور ان سب افراد نے ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل ڈھاکہ میں پناہ لے لی، جو کہ ریڈ کراس کے ماتحت تھا۔ اور "غیر جانبدار علاقہ" قرار دیا گیا۔ ڈھائی بجے نئی دہلی میں بھارتی حکام کو سوئٹزرلینڈ کے سفارتی حکام کے ذریعے ایک پیغام ملا کہ ان تمام افسران اور ممبرانِ کابینہ نے جنیوا کنونشن کی شرائط کے مطابق پناہ لے لی ہے۔ اور حکومتِ بھارت اور بنگلہ دیش سے درخواست کی ہے کہ ان کی حفاظت کی ضمانت دی جائے جیسا کہ ایک سرکاری ترجمان نے نئی دہلی میں اسی شام کو تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ڈھاکہ کی حکومت نے بنگلہ دیش کے حق میں اعلان کر دیا ہے۔

۱۴ دسمبر ۱۹۷۱ کو ڈھاکہ کی حفاظت کے لئے کٹھن دن گردانا گیا تھا جنرل نیازی نے اپنا صدر دفتر چھاؤنی سے ڈھاکہ یونیورسٹی میں منتقل کر لیا۔ ان کی منتقلی کے فوراً بعد ہی بھارتی حکام کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ اس طرح کے اقدامات سے شہری عمارتوں کو جو نقصان پہنچے گا اس کی تمام تر ذمہ داری پاکستانی حکام پر ہوگی۔

بھارتی فضائیہ نے یونیورسٹی پر پے در پے حملے کئے تاکہ جنرل نیازی کو معلوم ہو جائے کہ وہ جہاں بھی جائے گا، اس کا پیچھا کیا جائے گا۔

۱۵ دسمبر ۷۱ء کو امریکی سفارت خانے کی وساطت سے جنرل نیازی اور جنرل راؤ فرمان علی کے دستخطوں کیساتھ ایک پیغام نئی دہلی میں بھارتی حکام کو موصول ہوا جس میں

> **جنرل نیازی نے کہا**
>
> **"یحییٰ خاں آخری وقت تک مجھے دھوکا دیتا رہا اور ریڈیو پاکستان عنقریب "بڑی تبدیلی" رُونما ہونے کا مژدہ سناتا رہا"**

جنرل نیازی نے امریکی سفارتخانے کی وساطت سے ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کی



جنرل نیازی ہتھیار ڈالنے کے معاہدے پر دستخط کر رہے ہیں، ان کے برابر جنرل اروڑا بیٹھے ہیں

ہتھیار ڈالنے کی پیش کش اس شرط پر کی گئی تھی کہ پاکستانی فوج کو ہتھیار ڈالنے کے بعد طے شدہ مقامات پر پہنچنے کی اجازت دی جائے تاکہ وہاں سے ان کی واپسی ہو سکے۔ اسی قسم کی ایک اور پیش کش راؤ فرمان علی نے ۱۰ دسمبر کو کی تھی، مگر بھارتی اور بنگلہ دیش کے حکام نے اسے قبول نہیں کیا تھا۔

اس کے جواب میں جنرل مانک شاہ نے یکطرفہ طور پر ۱۶ دسمبر کو صبح نو بجے تک ہوائی حملے بند کرنے کی پیش کش کی، تاکہ پاکستانی حکام کو سوچنے کا وقت مل سکے۔ اس نے ریڈیائی رابطہ بھی قائم کیا تاکہ جنرل نیازی کوئی پیغام بھیج سکیں۔

وقت ختم ہونے سے آدھ گھنٹہ قبل جنرل مانک شاہ کو ایک ریڈیائی پیغام موصول ہوا جس میں ہوائی حملے نہ ہونے کی مدت میں چھ گھنٹے کی توسیع کی درخواست کی گئی تھی، تاکہ پاکستانی حکام ہتھیار ڈالنے کی شرائط کی تفصیلات طے کر سکیں۔ دس بجے جنرل مانک شاہ کا جواب موصول ہوا، جس میں یہ درخواست منظور کر لی گئی تھی۔ تین گھنٹے کے بعد جنرل جیکب ڈھاکہ میں ہیلی کاپٹر کے ذریعے ہتھیار ڈالنے کی شرائط کے ساتھ پہنچا۔ ان شرائط پر جنرل نیازی نے پونے تین بجے علامتی دستخط کئے تاکہ بعد میں ساڑھے چار بجے ان پر باقاعدہ دستخط کئے جا سکیں۔

اس اثناء میں ایک بھارتی بٹالین دس بجکر بہ منٹ پر ڈھاکہ میں داخل ہو گئی۔ یہ اس وقت ہوا جب بھارتی فوج کو معلوم ہوا کہ پاکستانی فوج نے ایک پل بغیر کسی حفاظت کے چھوڑ دیا ہے۔ اسی بٹالین کے سامنے میجر جنرل جمشید نے ہتھیار ڈال دیئے جو اس علاقے کے دفاع کے ذمہ دار تھے باقی چار بھارتی بٹالینیں جنرل گندھارو ناگرہ کی قیادت میں ساڑھے تین بجے ڈھاکہ میں داخل ہوئیں۔ اس کے بعد ریس کورس میدان میں ایک تقریب میں جنرل نیازی اور راؤ فرمان علی نے ہتھیار ڈالنے کی شرائط کے کاغذات پر دستخط کئے۔ اور اس موقع پر "جئے بنگلہ" اور "جئے ہند" کے فلک شگاف نعرے لگائے گئے۔ اس کے علاوہ شیخ مجیب الرحمن اور اندرا گاندھی کے حق میں بھی نعرے بلند ہوئے۔ اس موقع پر بھارتی فوج پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کی گئیں اور جنرل نیازی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف سخت نفرت کا اظہار کیا گیا۔

لیکن آزادی کی تمام خوشیاں ماند پڑ گئیں جب دوسرے دن ڈھاکہ کے عوام کو شہر سے باہر ۲۵۰ ڈاکٹروں، وکلاء، اساتذہ اور دوسرے لوگوں کی لاشیں ملیں۔ اس خونیں ڈرامے کا ارتکاب ایک تنظیم "البدر" نے پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے سے ایک دن قبل کیا تھا۔

صدر پاکستان فضل الٰہی چودھری

"قوم کو اُن کی قربانیوں پر فخر ہے"



قوم کا ذہن ہمارے ان بہادر بھائیوں کے ساتھ ہے جو بھارتی قید میں ہیں ہمارے لئے یہ خیال اذیت ناک ہے کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں لیکن وہ دن دور نہیں جب ہم دوبارہ ایک دوسرے سے ملیں گے۔ قوم پوری طرح جنگی کیمپوں میں ان کے مصائب کا پورا شعور رکھتی ہے جو لوگ جنگ ختم ہونے کے تقریباً ۲۰ ماہ بعد بھی برداشت کر رہے ہیں قوم کو ان کی قربانیوں پر فخر ہے۔ خدا ان کا حامی و ناصر ہے۔



وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو

ہمارا دِل اپنے بھائیوں کے لئے مُضطرب ہے

ہمارا دل اپنے ان بھائیوں کے لئے مضطرب ہے جنہیں بھارت نے جنگ ختم ہونے کے ۲۰ ماہ گزرنے کے بعد بھی غیر قانونی طور پر روک رکھا ہے، مجھے ان سے یہ کہنا ہے کہ قوم نے وہ بے مثال قربانیاں اور مصائب فراموش نہیں کئے ہیں جو آپ نے ملک کے لئے دیئے ہیں اور جو آپ اس وقت بھی ملک کے مفاد کے لئے برداشت کر رہے ہیں۔ یہ قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ آپ کی حکومت اپنے مسلمہ اصولوں کے مطابق آپ کی واپسی کے لئے باوقار طریقے سے ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وہ دن دور نہیں جب آپ سب دوبارہ اپنے خاندانوں سے آملیں گے، آپ پر خدا کی رحمت ہو۔

بھارتی اخبارات نے پاکستان کے موقف کو تسلیم کر لیا

جناب اقبال زبیری کا مضمون پاک بھارت حالیہ مذاکرات کے سلسلے میں خاصا اہم ہے۔ یہ ہمیں تاخیر سے ملا، اس وقت "الفتح" کی آخری کاپی زیر ترتیب تھی لہٰذا یہ مضمون آخری صفحات پر شائع ہو رہا ہے۔ (ادارہ)



تحریر : اقبال زبیری

بھارت کے تمام بڑے اخبارات بات چیت میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور نہ صرف خبریں نمایاں طور پر شائع کر رہے ہیں، بلکہ کئی اخبارات نے حالیہ بات چیت اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اداریئے لکھے ہیں۔

تقریباً تمام بھارتی اخبارات اس بات پر متفق ہیں، کہ پاکستان صدق دل سے برصغیر میں پائیدار امن کے قیام کا خواہشمند ہے۔ نئی دہلی کے روزنامہ ہندوستان ٹائمز نے ۱۸ اگست کو پاک بھارت مذاکرات کو لیڈ اسٹوری کے طور پر شائع کیا اور اپنی شہ سرخی میں اس حقیقت کا اعتراف کیا کہ پاکستان مذاکرات کو نتیجہ خیز بنانا چاہتا ہے۔ روزنامہ اسٹیٹسمین نے اسی روز برصغیر کی صورت حال پر اداریہ لکھا۔ اخبار نے بھارتی وزیر اعظم اندرا گاندھی کی اس تقریر پر سخت نکتہ چینی کی۔ جس میں انہوں نے کہا تھا کہ دہلی مذاکرات ناکام ہو گئے تو اس کی ذمہ داری پاکستان پر ہوگی۔ اسٹیٹسمین نے مسز اندرا گاندھی پر زور دیا ہے کہ وہ الزام تراشی کی بجائے مفاہمت کے جذبے سے کام لیں تاکہ برصغیر مذاکرات کی ناکامی کی صورت میں ہولناک نتائج سے بچ جائے۔ اخبار کے اداریہ کا متن یہ ہے۔



اسٹیٹسمین کا اداریہ

برصغیر کے تینوں ممالک کے لئے ضروری ہے کہ نئی دہلی میں شروع ہونے والے پاک بھارت مذاکرات کامیاب ثابت ہوں۔ اگرچہ تمام متنازعہ مسائل کے متعلق فوری سمجھوتہ کا امکان نہیں۔ لیکن یہ صورت حال ایک محدود سمجھوتے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ جس کے تحت تینوں ملکوں میں رکے ہوئے لوگوں کی مجوزہ واپسی پر عمل درآمد کیا جا سکے۔ ایک بار اگر یہ سلسلہ شروع ہو جائے تو ایک جامع سمجھوتہ زیادہ مشکل

THE STATESMAN

incorporating and directly descended from THE FRIEND OF INDIA—Founded 1818

Published Simultaneously from DELHI and CALCUTTA

DELHI, AUGUST 18, 1973 Vol. No. CVVXIII 2374

THE NEED TO AGREE

Important for all three in this subcontinent Indo-Pakistani talks a corresponding flexibility on the Pakistani side. Mr Bhutto cannot expect a formal commitment from

ڈھاکہ کے موقف میں لچک پیدا ہو گئی

نہیں رہے گا۔ اگر مذاکرات ناکام ثابت ہوئے تو تینوں ممالک کے چارہ کار کا دائرہ بہت محدود ہو جائے گا۔ سمجھوتہ کی راہ تلاش کرنے میں زیادہ عرصہ لگا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر سفارتی سطح کے مذاکرات میں ہوا کرتا ہے لیکن عوام میں بڑھتی ہوئی بے چینی ایسی چیز نہیں کہ جسے حکومتیں یک قلم نظر انداز کر سکیں۔

تینوں حکومتوں کی اس بے چینی کا بھی خیال رکھنا ہو گا جو عالمی برادری میں پائی جاتی ہے۔ اور اس حقیقت پر بھی نگاہ رکھنا ضروری ہے کہ وہ بین الاقوامی خیر سگالی سے محروم ہو رہی ہیں ظاہری





مسز اندرا گاندھی الزام تراشی کے بجائے مفاہمت کے جذبہ سے کام لیں

صورت حال مایوس کن بھی نہیں۔ جہاں تک زیر نظر مسائل کا تعلق ہے معلوم ہوا ہے کہ ان کے متعلق بھارت اور بنگلہ دیش میں اتفاق رائے ہو گیا ہے۔ یہ تو ظاہر نہیں کیا گیا کہ ڈھاکہ میں مسٹر ہکسر نے کیا بات چیت کی۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس میں پاکستان کا یہ مطالبہ بھی شامل ہو گا کہ جنگی قیدیوں کے خلاف مقدمات چلانے کا ارادہ ترک کر دیا جائے۔ اور بنگلہ دیش سے پاکستان بھیجے جانے والے پاکستانیوں (غیر بنگالیوں) کی تعداد محدود کی جائے۔ اگرچہ بھارت اس معاملے میں بنگلہ دیش پر کوئی اثر ڈالنا نہیں چاہتا۔

لیکن وہ واضح طور پر یہ تسلیم کرتا ہے کہ اگر جنگی قیدیوں کے خلاف مقدمہ چلانے کا مسئلہ حل کر لیا جائے تو تینوں ملکوں میں رکے ہوئے لوگوں کی وطن واپسی کے سوال پر مصالحت آسان ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں یہ بات بھی ممد ثابت ہو سکتی ہے کہ بنگلہ دیش پاکستان کے اس (مبینہ) وعدے کی تکمیل پر اصرار نہ کرے کہ وہ بنگلہ دیش میں مقیم تمام کے تمام یعنی دو لاکھ ساٹھ ہزار غیر بنگالیوں کو واپس لے لیگا۔ جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ خود بھی پاکستان واپس جانا چاہتے ہیں۔ اگرچہ اس تعداد کو اس حد تک کم کرنے کا کوئی سوال نہیں جو مسٹر بھٹو کے ذہن میں ہے۔ لیکن مسٹر ہکسر سے مذاکرات کے بعد ڈھاکہ کے موقف میں کچھ اور لچک پیدا ہو گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مذاکرات کا آگے بڑھنا ممکن ہو گا، بشرطیکہ پاکستان کے موقف میں بھی اسی طرح کی لچک پیدا ہو جائے۔

مسٹر بھٹو بنگلہ دیش سے اس قسم کے رسمی وعدے کی توقع نہیں کر سکتے کہ جنگی قیدیوں کے خلاف مقدمہ غیر معینہ مدت تک التواء میں ڈال دیا جائے گا۔ یا بنگلہ دیش سے غیر بنگالیوں کی محدود تعداد کی واپسی بھی قابل قبول ہو گی۔ لیکن یہ صورت بھی باعث طمانیت ہو گی کہ خاموشی سے کوئی مفاہمت ہو جائے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ مقدمات اب تک شروع نہیں ہوئے۔ اور ان کے لئے تاریخ بھی مقرر نہیں کی گئی۔ واضح مصلحت کے لئے پاکستان کو براہ راست بنگلہ دیش سے رجوع کرنا ہو گا۔ جس کے لئے ضروری ہے کہ بنگلہ دیش کو ہر ممکن عجلت کے ساتھ تسلیم کر لیا جائے۔ اب جبکہ پاکستان میں ایک نئے آئینی دور کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس معاملہ میں مزید تاخیر کے لئے کوئی عذر موجود نہیں۔

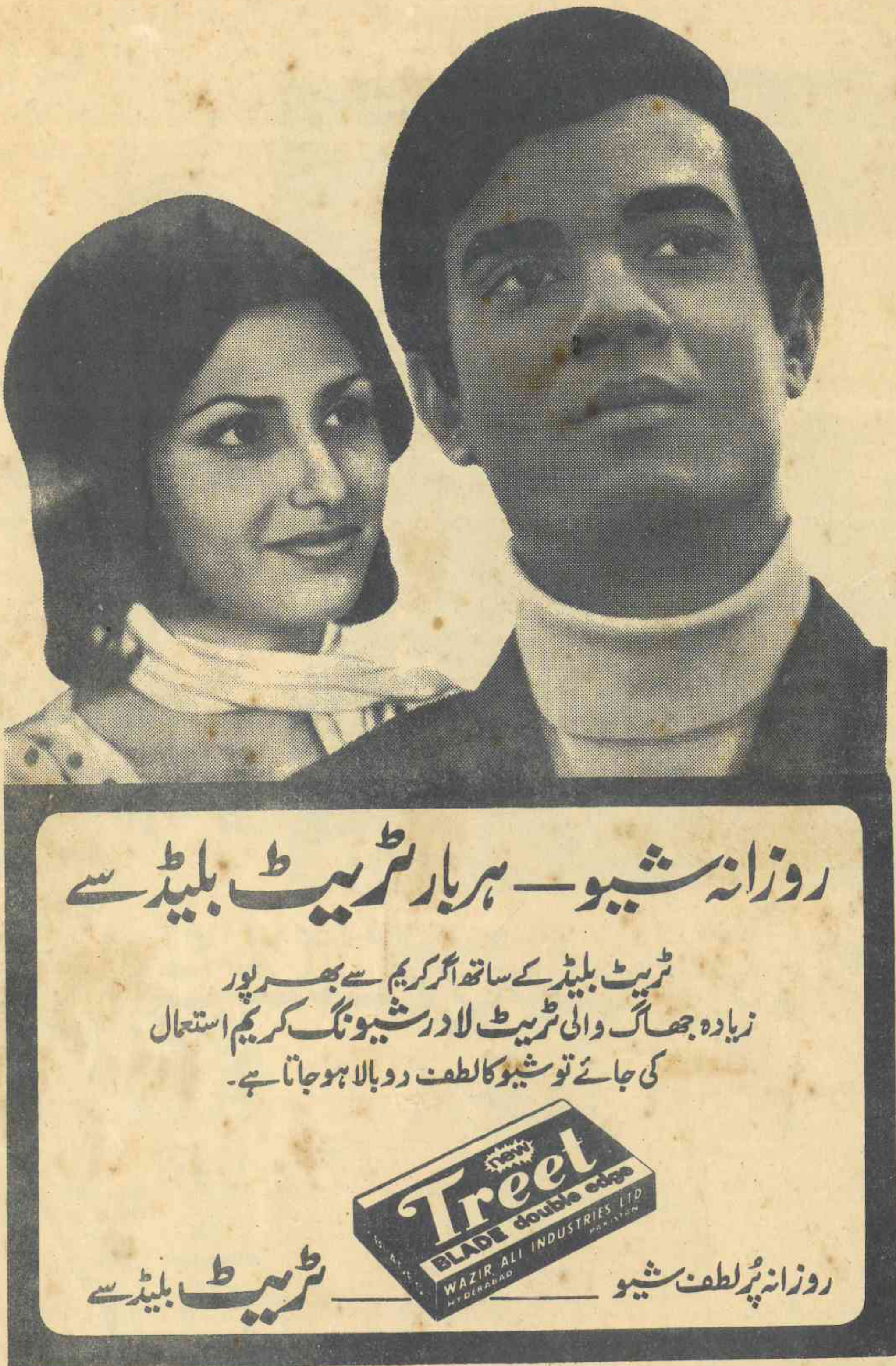
لیکن نئی دہلی میں کوئی سمجھوتہ کرنے کے لئے اسکا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں کہ پاکستان بنگلہ دیش کو تسلیم کر لے۔ اس لئے کہ ایسی صورت پیدا ہونے سے قبل بھی سہ طرفہ مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ مذاکرات کا عمل بہت طویل ہوتا ہے۔ اس لئے مذاکرات شروع ہونے سے اسلام آباد، ڈھاکہ کے مذاکرات پر کوئی زد نہیں پڑے گی۔

اگر بنگلہ دیش کو جلد ہی تسلیم کر لیا جائے تو جنگی قیدیوں کے خلاف مقدمات اور واپس بھیجے جانے والے پاکستانی باشندوں کی تعداد کے مسائل براہ راست مذاکرات کے ذریعے حل کئے جا سکتے ہیں۔ اگر یہ مسائل آسانی سے حل نہ ہو سکیں تو مذاکرات عارضی طور پر معطل کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ مناسب نہیں۔ اس لئے کہ اسلام آباد اور ڈھاکہ دونوں غالباً یہ محسوس کر چکے ہیں کہ صورت حال کس قدر سنگین ہے۔ سمجھوتے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ پاکستانی جنگی قیدیوں کے خلاف مقدمہ کا ذکر کیا جائے۔ یا واپس بھیجے جانے والے پاکستانیوں کی تعداد متعین کی جائے۔ کسی حد تک باہمی اعتماد کی ضرورت بالکل واضح ہے۔ دوسری صورت میں تعطل پیدا ہو گا جو شاید مستقبل قریب میں دور نہیں ہو سکے گا۔ مسز اندرا گاندھی نے کہا ہے کہ اگر مذاکرات ناکام ہوئے تو اس کی ذمہ داری بھارت یا بنگلہ دیش پر نہیں ہو گی۔ لیکن اس ناکامی کی ذمہ داری کا سوال چنداں اہم نہ ہو گا۔

بقیہ اداریہ

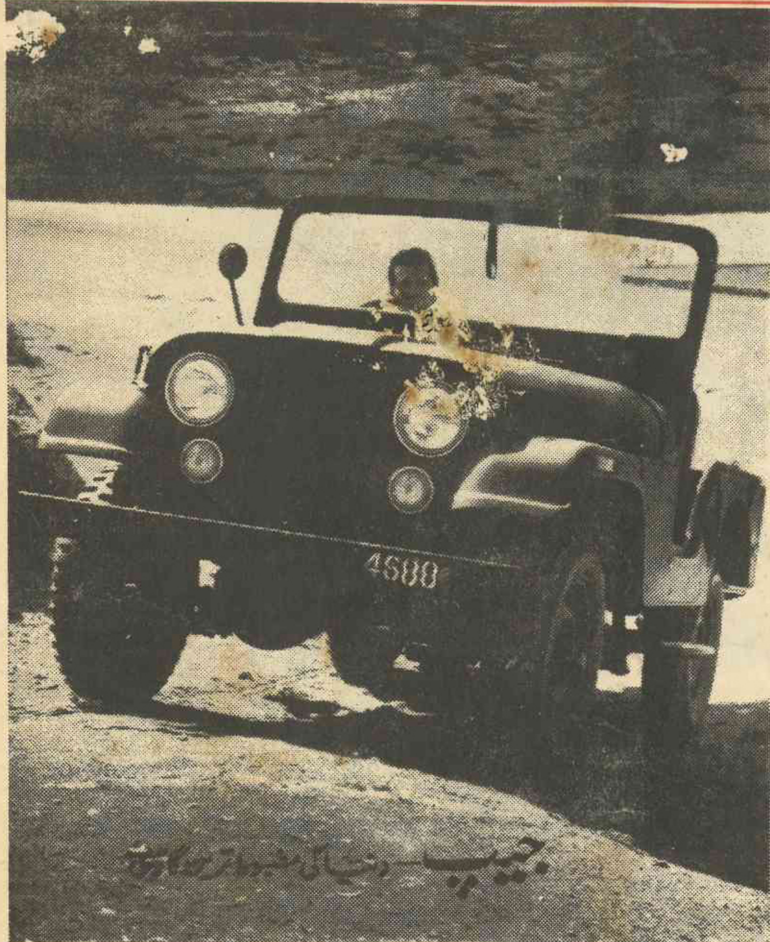
ہم سوچ نہیں سکتے کہ ترانوے ہزار جنگی قیدیوں کو بھارت کے حوالے کرنے کے باوجود اسی ڈگر پر کام ہو گا۔

یہ ذہن میں رہنا چاہیئے کہ ہمارے جنگی قیدی ابھی بھارت میں نظر بند ہیں، اور ہماری آنکھیں ان کی جلد واپسی کی منتظر ہیں۔



روزانہ شیو — ہر بار ٹریٹ بلیڈ سے
ٹریٹ بلیڈ کے ساتھ اگر کریم سے بھرپور
زیادہ جھاگ والی ٹریٹ لادر شیونگ کریم استعمال
کی جائے تو شیو کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔
new
Treet
BLADE double edge
WAZIR ALI INDUSTRIES LTD
HYDERABAD
روزانہ پُرلطف شیو —— ٹریٹ بلیڈ سے

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
23-30 AUGUST 1973





جنگی قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ

قومی سطح پر حل کیا جائے

پاکستان



بیگم نصرت بھٹو کا پیغام

الفتح کے اجرا سے آج تک ہم نے اس جریدہ کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا ہے۔ خصوصاً اس وقت بھی جب الفتح نیا نیا نکلنا شروع ہوا تھا اور اپنی زیست کو قائم رکھنے کے لئے متعدد مشکلات کا شکار تھا، اور آج بھی جبکہ اس کے بعض آرٹیکلز ناواقفیت کی بنا پر غیر ضروری تنقید پر مبنی ہیں۔ ہمارا جذبۂ تعاون پہلے ہی کی طرح ہے اور ہمارے خلوص میں کسی طرح بھی کمی نہیں آئی ہے۔

آپ پاکستانی جنگی قیدیوں کے متعلق ایک نمبر نکال رہے ہیں اور آپکی حسب خواہش میں اپنے تاثرات دے رہی ہوں۔ ہمارے جنگی قیدیوں کی رہائی کا مسئلہ نہ صرف ایک شدید انسانی مسئلہ ہے، بلکہ یہ بین الاقوامی قوانین کے احترام اور انصاف کے لئے بھی سخت آزمائش کا معاملہ ہے۔ عوامی حکومت کی ہر ممکن کوشش اور انسانیت پسند اقوام کے زُود افزوں دباؤ کے باوجود یہ مسئلہ کھٹائی میں پڑا ہوا ہے، اسے حل کرنے کی ہر کوشش زور ا زوری کی سیاست کے کسی نہ کسی کانٹے سے الجھ کر رہ جاتی ہے اور اس کا انسانی پہلو دوسری پیچیدگیوں کے گرداب میں پھنس کر معرض التوا میں پڑ جاتا رہا ہے۔ یہ صرف ان ماں باپ، بھائی بہن، بیویوں اور معصوم بچوں کا المیہ نہیں، جو اپنے قیدی عزیز و اقارب کے انتظار میں رنج و غم، آس اور یاس کی صبر آزما گھڑیاں گن گن کر چور ہو گئے ہیں، بلکہ یہ ساری انسانی برادری کا مشترکہ مسئلہ ہے، اسے انصاف کے تقاضوں کے مطابق طے کرنے کی کوشش کرنا ہر فرد و بشر جس کے پہلو میں دل ہے اور ہر قوم جسے قانون کا احترام ہے سب کا یکساں فرض ہے۔ اس فرض کی انجام دہی عالمی ضمیر کے لئے ایک کھلا چیلنج ہے۔

اس مسئلہ کے انسانی پہلوؤں کو اجاگر کرکے دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑنے کا فریضہ ہمارے اپنے دانشوروں، دیبوں اور فنکاروں پر بھی عائد ہوتا ہے، صحافت ہو ثقافت، ادب ہو یا فنونِ لطیفہ، ہمارے جنگی قیدی ان سب کی تخلیقی توجہ اور ہمدردی کے محتاج ہیں۔ قید و بند کی صعوبتوں میں گھرے ہوئے نوّے ہزار انسانوں کا المیہ اتنا بڑا سانحہ ہے کہ اس پر حسّاس اہلِ قلم اور فنکار کی پکار ساری دنیا کو خون کے آنسو رُلا سکتی ہے۔

قومی سطح پر یہ کسی مخصوص سیاسی جماعت کا مسئلہ نہیں، بیرونی حالات اور واقعات نے جنگی قیدیوں کی رہائی کو جن دوسری بہت سی گتھیوں میں الجھا رکھا ہے، ان سب پر ٹھنڈے دل سے غور کرکے سلجھانا ساری قوم کا فرض ہے۔ انہیں جذباتی یا جماعتی مصلحتوں، تضادوں اور تصادموں کی زد میں لانا جنگی قیدیوں کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے اور قومی مفاد کے سراسر خلاف ہوگا۔ جنگی قیدیوں کی رہائی اور اس کے ساتھ منسلکہ تمام مسائل کو روزمرّہ کی سیاست سے بالاتر رکھ کر ہی قوم میں وہ یک جہتی پیدا کی جا سکتی ہے جو اس نازک معاملے کا حل تلاش کرنے کے لئے لازمی ہے۔ اس قسم کی یک جہتی کے بغیر ہماری جدوجہد کمزور اور ہماری ہر کوشش نامکمل رہے گی اگر ایسا ہوا، تو پھر نوّے ہزار مظلوم قیدیوں اور ان کے لاکھوں منتظر اور مضطرب لواحقین کے ساتھ بے حد ناانصافی ہوگی۔

خدا کرے عوامی حکومت، سیاست، صحافت، ثقافت اور اربابِ علم و دانش کے فکر و عمل میں ایسی ہم آہنگی پیدا ہو، کہ انکے باہمی تعاون اور اشتراک سے ہمارے جنگی قیدیوں اور انکے عزیز و اقارب کے مسلسل انتظار کی تاریک اور طویل رات جلد سے جلد کٹ جائیگا۔

پاک فضائیہ کے سربراہ
ایئر مارشل ظفر چوہدری کا پیغام



بھارت بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے

جنگی قیدیوں کے متعلق بین الاقوامی قانون کی رُو سے بھارت اور پاکستان کے درمیان ۱۹۷۱ء کی جنگ کے دوران سرگرم مخاصمت کے بعد جنگی قیدیوں کو فوراً آزاد کر کے واپس کر دینا چاہیئے تھا۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اس پوزیشن کی دوبارہ توثیق کی گئی تھی، جبکہ اس نے جنگی قیدیوں کی فوری رہائی کے متعلق متفقہ طور پر قرار دادیں منظور کی تھیں۔ بین الاقوامی پریس اور عالمی رائے عامہ بھی جنگی قیدیوں کی غیر مشروط واپسی کی وکالت کر رہی ہیں لیکن بھارت بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کر رہا ہے اور پاکستان سے سیاسی مراعات حاصل کرنے کے لئے ہمارے جنگی قیدیوں کو نظر بند رکھنے کی خاطر عالمی رائے عامہ کو ٹھکرا رہا ہے۔ بین الاقوامی قانون مخاصمانہ ماحول کے اختتام تک عارضی طور پر نظر بندی کی اجازت دیتا ہے، اور وہ بھی سزا کے طور پر نہیں بلکہ اس کا مقصد ان کو جنگ میں دوبارہ شرکت سے باز رکھنا ہے۔ تاہم ہمارے جنگی قیدیوں کو گزشتہ ۱۹ ماہ سے غیر قانونی طور پر رکھا گیا ہے۔

اور سپاہی اور انسان ہونے کے ناطے سے وہ جس احترام اور وقار کے مستحق ہیں۔ اس سے انہیں محروم رکھا گیا۔ وہ ناقص غذا، گھٹیا اور غیر انسانی ماحول، طبی سہولتوں کے فقدان، بار بار پوچھ گچھ اور مسلسل ایذا رسانی کے سبب مضر اثرات کا شکار ہیں۔ اب تک بھارت میں جنگی قیدیوں کے کیمپوں میں بارہ تیرہ بار فائرنگ کے دوران ۵۴ جنگی قیدی شہید اور ۷۰ زخمی ہو چکے ہیں، ان پر مصائب کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔

اس المیہ میں اس حقیقت سے اور شدت پیدا ہوتی ہے کہ بھارت میں نوّے ہزار جنگی قیدیوں میں سے بیس ہزار قیدی شہری ہیں۔ جن میں مرد عورتیں اور بچے سبھی شامل ہیں اور ان کی نظر بندی کا کوئی جواز پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اسی پر بس نہیں۔ جنگی قیدیوں کے خاندانوں کی تنگ دستی اور امید اور ناامیدی کی غیر یقینی صورت حال سے بڑوں اور بچوں پر یکساں طور پر شدید جذباتی اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور اس سے پیچیدہ انسانی مسائل میں اضافہ ہو رہا ہے۔

جو لوگ انسانی اقدار اور انسانی وقار پر یقین رکھتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ وہ بھارت کو مہذبانہ رویہ اختیار کرنے اور جنگی قیدیوں کو خالصتاً ایک انسانی مسئلہ سمجھنے پر مجبور کریں۔ پریس اور ابلاغ عامہ کے ذرائع جنگی قیدیوں کی فوری اور غیر مشروط رہائی کے لئے رائے عامہ کو ہموار کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں ہفت روزہ "الفتح" کی کوششوں کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔



جنرل ٹکا خان



ایڈمرل۔ ایچ۔ ایچ احمد

جنگی قیدیوں کی قربانیاں ناقابل فراموش ہیں

بری اور بحری افواج کے سربراہوں نے جنگی قیدیوں کے نام ایک مشترکہ پیغام میں کہا:۔

"قومی مقاصد کے لئے آپ نے جو قربانیاں دیں اور تکالیف میں جرأت اور صبر کا مظاہرہ کیا ہے، وہ مسلح افواج میں ہم تمام کے لئے ہمیشہ طاقت کا ذریعہ رہے گا۔ ہم یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے ذہنوں میں آپ کے خاندانوں کی بہبود کو اولیت حاصل ہے اور ہم آپ لوگوں کی واپسی کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں اور ہمیں توقع ہے کہ تکالیف کے دن بہت جلد ختم ہو جائیں گے اور آپ لوگ اپنے وطن جلد واپس ہونگے، جہاں آپ کے ساتھی آپ لوگوں کا خیر مقدم کریں گے۔ اِنَّ اللہ مَعَ الصّابِرین۔